بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرف آغاز

الیکشن کا طوفان گزر گیا، فتح وشکست کے تناسب سے سیاسی پارٹیاں اپنی اپنی کارکردگی کا تجزیہ کرنے اور اپنے اپنے طور پر حساب کتاب لگانے میں مصروف ہیں، ان انتخابات کے بعد جو نتائج سامنے آئے ہیں، ان سے سبق حاصل کرکے ملک کی سیاسی جماعتوں نے کئی سال بعد آنے والے انتخابات کے لیے ابھی سے حکمت عملی مرتب کرنی شروع کردی ہے۔

حالیہ انتخابات کے جو نتائج آئے ہیں، ان سے مسلمانوں کا فکر وتشویش میں مبتلا ہونا ایک فطری امر ہے، یہ نتائج نہ صرف مسلمان، بلکہ برادران وطن کی اس بڑی تعداد کی پسند کے بھی مطابق نہیں ہیں، جو ہندوستان کی جمہوریت، اس کے سیکولر کردار اور ہندو مسلم اتحاد کو عزیز رکھتے ہیں، اور ملک کی سالمیت اور تعمیر وترقی کے لیے ان کو ضروری عنصر سمجھتے ہیں۔

موجودہ صورت حال مسلمانوں کے لیے بڑی اہمیت کی حامل ہے، یہ وقت مسلمانوں کے لیے سنبھلنے اور اپنے اندر شعور اور سوجھ بوجھ پیدا کرنے کا ہے۔ ہندوستان کے مسلمان اگرچہ تعداد کے اعتبار سے برادران وطن سے کم ہیں، لیکن یہ کمی ایسی نہیں ہے کہ ان کا کوئی وزن نہ ہو، اس ملک میں بسنے والے مسلمانوں کی تعداد دوسری تمام اقلیتوں سے بدرجہا زائد ہے، اور یہ اتنی بڑی تعداد ہے کہ اگر سنجیدگی، حکمت عملی اور فکر وتدبر کے ساتھ کوئی قدم اٹھایا جائے، تو اس ملک کے حق میں ہونے والے ہر فیصلے میں ان کی رائے اور تدبیر اثر انداز ہوگی، لیکن ان اوصاف کے فقدان کی وجہ سے مسلمانوں کا جو حال زبوں ہے، وہ ہر شخص کی نگاہ کے سامنے ہے۔

ان انتخابات کے نتائج اگرچہ بہت سے لوگوں کو دعوت فکر ونظر دے رہے ہیں، لیکن ان سب سے زیادہ سبق لینے کی ضرورت مسلمانوں کو ہے۔ ایک باحیثیت اور باعزت انسان کے طور پر زندگی

گزارنے کے لیےان کواپنے اندر بہت سی تبدیلیاں کرنی پڑیں گی،اگر مسلمان بن کر رہنا ہے،تو سب سے پہلے تو ان کوسچا اور پکا مسلمان بننا پڑے گا،اوراس یقین کامل کے ساتھ جینا ہوگا کہ ان کے عزت وشرف کا اصلی وحقیقی معیار راسخ العقیدہ اور باعمل مسلمان ہونے میں ہے،اس کے بغیر ان کی عزت وترقی ممکن نہیں ہے، اسی میں دنیا وآخرت دونوں کی کامیابی وسرخ روئی ہے۔آج مسلمانوں کے زوال وانحطاط،ان کے ذلت وادباراوران کودرپیش مسائل ومشکلات کاسب سے بڑا سبب دین سے دوری،عمل کی کوتاہی اور بے راہ روی ہے۔مسلمان عقیدہ وعمل دونوں اعتبار سے پستی کے جس غار کی طرف جارہے ہیں،وہ بے حد تکلیف دہ اورکرب انگیز ہے،مردم شماری کے رجسٹر میں ان کا اندراج تو اس خانے میں ہے جوایک خداپرایمان رکھنے والےاوردین اسلام کواپنا مذہب قرار دینے والے ہیں، لیکن اسلام کا کلمہ پڑھنے کے بعداس کا جوتقاضا ہے،ہم میں سے کتنے مسلمان ہیں جواس کو پورا کرتے یااس پر پورے اترتے ہیں۔اسلام کا تقاضا کیا ہے؟ایک صحابیؓ نے سرکاررسالتمآب ﷺ سےعرض کیا کہ حضرت آپ مجھےکوئی بہت جامع اورمفید بات بتلادیجئے،ایسی بات جس کو میں مضبوطی سے تھام لوں اورگرہ سے باندھ لوں،آپؐ نے فرمایا کہ: **قل آمنت باللّٰہ ثم استقم** . (اللہ پر ایمان لاؤ پھر اس پر ثابت قدم ہو جاؤ) یعنی اسلام کی تعلیمات پر مضبوطی کے ساتھ جم جاؤ،استقامت اور ثابت قدمی کے سنگ گراں بن جاؤ،خدا کومعبود برحق ماننے کے بعداس کے ہرحکم کے آگے سرتسلیم اورگردن اطاعت خم کردو،چنانچہ دوسری روایت میں یہ لفظ ’’**ربی اللّٰہ ثم استقم**‘‘ کےعنوان سے آیا ہے۔ خدائے وحدہ لاشریک کےحکم کے آگےتمہارا سراس طرح جھک جائے کہ وقت،حالات اورحوادث زمانہ میں سے کوئی چیزتم کومتزلزل نہ کرسکے،اس قسم کی ثابت قدمی اگر ہوگی،تو تمہارےحق میں اللہ کا جووعدہ ہے وہ پورا ہوگا،اورتم اس کےلطف وعنایت اورنصرت کےمستحق ہوگے ﴿إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰئِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ﴾[فصلت:۳۰](جن لوگوں نے (دل سے)اقرار کرلیا کہ ہمارارب اللہ ہے،پھراس پر مستقیم رہے،ان پر فرشتے اتریں گے کہ تم اندیشہ نہ کرواور نہ رنج کرواورتم جنت (کے ملنے) پرخوش رہوجس کاتم سے(پیغمبروں کی معرفت)وعدہ کیا جاتا تھا)۔

لیکن یہ اسی وقت ہے جب اسلام کے نام لیوا سچے اور پکے مسلمان بن کررہیں،ان کے کے

اندر تذبذب اور بے یقینی نہ ہو، اس طرح رہنے سے وہ عزت وسر بلندی اور سروری حاصل نہیں ہوسکتی، جو بحیثیت مسلمان کے ان کو حاصل ہونی چاہئے، اور جس کے بارے میں اللہ رب العزت نے اپنے پاک کلام میں یہ فرمایا ہے﴿وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ﴾ (اور تم ہمت مت ہارو اور رنج مت کرو، غالب تم ہی رہو گے اگر تم پورے مؤمن رہے)۔

مسلمان کا یہ شیوہ ہونا چاہئے کہ نفع ونقصان اور خیر وشر ہر چیز کا خالق ومالک اسی ذات احد وصمد کو سمجھے اور یہ یقین رکھے کہ خدائے وحدہ لاشریک جس کو نفع پہنچانا چاہے، اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا، اور جس کو نقصان پہنچانے کا فیصلہ کرلے، اس کو پوری دنیا کی طاقت مل کر کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی، انتہائی صحیح اور اہم حدیث میں رسول برحق ﷺ نے اپنے چچازاد بھائی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے فرمایا تھا: **اِحْفَظِ اللّٰهَ يَحْفَظْكَ، اِحْفَظِ اللّٰهَ تَجِدْهُ تُجَاهَكَ، وَإِذَا سَأَلْتَ فَاسْأَلِ اللّٰهَ، وَإِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ، وَاعْلَمْ أَنَّ الْأُمَّةَ لَوِاجْتَمَعَتْ عَلَى أَنْ يَنْفَعُوكَ بِشَيْئٍ لَمْ يَنْفَعُوكَ إِلَّا بِشَيْئٍ قَدْ كَتَبَهُ اللّٰهُ لَكَ، وَلَوِاجْتَمَعُوا عَلَى أَنْ يَضُرُّوكَ بِشَيْئٍ قَدْ كَتَبَهُ اللّٰهُ عَلَيْكَ، رُفِعَتِ الْأَقْلَامُ وَجَفَّتِ الصُّحُف.** یعنی اللہ کی حفاظت کرو (اس کے احکام کی پابندی کرو) وہ تمھاری حفاظت فرمائے گا، اللہ کی اطاعت اور اس کی رضا جوئی کی کوشش کرو تو تم اس کو اپنے سامنے پاؤ گے، اگر تم کوئی چیز مانگو تو اللہ ہی سے مانگو، اگر مدد مانگو تو اللہ ہی سے مانگو۔ تم کو اس بات کا علم اور یقین ہونا چاہئے کہ سب لوگ مل کر تم کو کوئی فائدہ پہنچانا چاہیں تو تم کو اسی چیز کا فائدہ پہنچا سکتے ہیں جس کو اللہ نے تمھارے لیے مقدر کر رکھا ہے، اور اگر سب مل کر تم کو نقصان پہنچانا چاہیں، تو اللہ نے جو لکھ رکھا ہے اسی سے نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ آخر میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ یہی اللہ کا نوشتہ اور فیصلہ ہے۔

امت مسلمہ کی تاریخ شاہد ہے کہ جب تک مسلمانوں کے اندر ایمان ویقین کی پختگی تھی، تسلیم واطاعت کا جذبہ تھا، عبادت وبندگی کی روح اور اسپرٹ تھی، تو نہ صرف عزت وسر بلندی ان کے قدم چومتی تھی، بلکہ پوری دنیا پر ان کی حکمرانی تھی، عرب وعجم ہر جگہ ان کا دبدبہ تھا، یہ صرف عہد نبویؐ یا عہد صحابہؓ کی بات نہیں ہے، بلکہ سیکڑوں سالہ تاریخ اس کی گواہ ہے۔

لیکن جب سے مسلمانوں کے اندر کمزوری آئی، ان کے دلوں میں دین داری کی جگہ دنیا

داری نے بنالی، اسی کے ساتھ اخلاق ومعاملات، معاشرت اور تعلیم وتربیت غرض زندگی کے ہر شعبے میں ناقابل بیان حد تک زوال وانحطاط آیا، تو ذلت وپستی کی اس منزل تک پہنچ گئے کہ آج پوری دنیا کے اندر نہ صرف محکوم بلکہ مظلوم ومقہور نظر آرہے ہیں، اور ہندوستان جیسے سیکولر اور جمہوری ملک میں ان کی حالت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ انتہائی پسماندہ ذاتوں اور برادریوں سے بھی بدتر حالت ان کی سمجھی جارہی ہے، یہ مسلمانوں کے لیے اتنا بڑا المیہ اور لمحۂ فکر یہ ہے کہ اس پر جس قدر ماتم کیا جائے کم ہے، اور اس سے زیادہ افسوس اور تکلیف کی بات یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کو اپنی اس حالت کا احساس بھی نہیں ہے، اور ہماری حالت شاعر کے اس شعر کی طرح ہوگئی ہے کہ:

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا　　　کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

مسلمان اگر ترقی چاہتے ہیں، عزت کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتے ہیں، تو ہوش کے ناخن لینے ہوں گے، آنکھیں کھولنی ہوں گی، اور احساس وشعور کو بیدار کرنا ہوگا، وقت کی قدر کرنی ہوگی، تضیع اوقات سے بچنا ہوگا، حالات وواقعات سے سبق حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا کرنی ہوگی، پسماندگی کے اسباب کو پس پشت ڈال کر ان راستوں کو اختیار کرنا ہوگا، جن پر چل کر علمی، تعلیمی، سماجی اور معاشی واقتصادی ترقی کی منزل تک پہنچ سکتے ہیں، اور اس طریقۂ کار کو منتخب کرنا ہوگا، جس میں ہماری حقیقی ترقی کا راز مضمر ہے۔

اور ان سب کے ساتھ ہمارے اندر ایسی حکمت عملی ہونی چاہئے، جس سے ہمارا وزن سمجھ میں آئے، اور ہماری حیثیت محض ایک ہنگامہ اور شور وغوغا کرنے والی بھیڑ کی طرح نہ رہ جائے۔ الیکشن ہی کو اگر دیکھ لیا جائے، تو مسلمانوں کا جوش وخروش اور ان کی آپس کی چشمک اور رسہ کشی دشمنی اور عداوت تک پہنچ جاتی ہے، باقاعدہ محاذ آرائی اور مورچہ بندی تک نوبت آجاتی ہے، اور پوری مدت انتخاب میں الیکشن کی باتوں پر وقت ضائع کرنے کے علاوہ ان کا کوئی دوسرا کام نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس برادران وطن کا حال یہ ہے (کم ازکم مئوشہر میں تو ہم یہی دیکھتے ہیں) کہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ان کو الیکشن سے کوئی سروکار ہے، وہ اپنے کاموں میں مصروف رہتے ہیں، اور ووٹ بھی دیتے ہیں تو اس قدر خاموشی کے ساتھ اور منصوبہ بند طریقے سے دیتے ہیں کہ آواز بھی سنائی نہیں دیتی۔ حالانکہ ہمارا دین ہم کو تحمل، تفکر اور تدبر کی تعلیم دیتا ہے، اور ہر غیر شائستہ اور غیر مہذب طریقہ کار سے بچنے کی

تاکید کرتا ہے، لیکن معاملہ کتنا برعکس ہوگیا ہے کہ اگر مصلحت اور حکمت عملی کے زاویۂ نظر سے بھی دیکھا جائے تو مسلمانوں کو انتہائی خاموشی اور یگانگت و یک جہتی کے ساتھ اپنا حق رائے دہی استعمال کرنا چاہئے۔ حیرت ہے برادران وطن کی حکمت عملی پر کہ تعداد کی بھاری اکثریت ہونے کے باوجود ان کے اندر شور و ہنگامہ نہیں ہوتا، اور افسوس ہے مسلمانوں کی کوتاہ فہمی پر کہ قلیل تعداد میں ہونے کے باوجود آسمان سر پر اٹھائے رہتے ہیں، اور یہی کیفیت نتائج کے اعلان کے بعد بھی رہی، کہ اس زبردست انقلاب کے بعد بھی برادران وطن کی طرف سے نہ کہیں کوئی جلوس اور نہ جشن فتح، جب کہ اگر اس کے برعکس ہوتا ہے تو ہم مسلمان اس قدر راو دھم مچاتے ہیں کہ الامان والحفیظ، کہیں ہماری حالت شاعر کے اس شعر کی طرح تو نہیں ہوگئی ہے:

وضع میں ہو جو نصاریٰ تو تمدن میں یہود
یہ مسلماں ہیں جنھیں دیکھ کے شرمائیں ہنود

☆☆☆☆☆☆

☆☆☆

☆☆

صفحہ ۷۰ کا بقیہ اور سمجھ بوجھ کے ایسے معیار قائم کر دیئے جن پر پرکھنے کے لئے کسی بھی راوی حدیث کے مقام و مرتبہ اور نقل حدیث کی صلاحیت و قابلیت معلوم ہوسکتی ہے۔ اس طرح الفاظ قرآن کے ساتھ اس کے معانی و مضامین کی شرح حدیث کو بھی ان اصول و ضوابط کے ذریعہ ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لیا گیا۔ پہلی صدی ہجری رخصت ہونے کے لئے جب رخت سفر باندھتی ہے تو جہاں وہ ایک ایک صحابی رسول کو اپنا رفیق سفر بنا لیتی ہے، وہیں حدیث کی ساری امانتیں جو رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کے سپرد کی تھیں صحابہ کرام مکمل طور پر آنے والی نسلوں کو سپرد کر کے اپنے فرض سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ اور حدیث کا سارا سرمایہ کلی طور پر پورے اعتماد و وثوق کے ساتھ مستقبل کے حوالے کیا جا چکا تھا، اور اسی احتیاط کے ساتھ ان اکابر امت کے پاس حدیثوں کا ذخیرہ پہونچا جنہوں نے ان کو کتابی شکل میں ساری دنیا کے سامنے پیش کر دیا جو آج ہمارے سامنے ہے۔ ''افکار عالم''

ماخوذ:ازتفسیرعزیزی (مسلسل)

تفسیر سورة التكوير

وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ ۝

اوررات کی جب پھیل جائے

یعنی میں قسم کھاتا ہوں رات کی جب وہ پھیلے، جب رات آتی ہےتو ایک بڑاانقلاب ظاہر ہوتا ہے کہ بازاراجڑ جاتے ہیں، چوروں، ڈاکوؤں کا ڈر، درندوں کا خوف پیدا ہوجاتا ہے، راستے بند، تلاشِ معاش موقوف، اورتمام لوگ چپ چاپ مُردوں کی طرح بے حس وحرکت پڑے رہتے ہیں اورشیاطین وجن پھیل جاتے ہیں۔ یہ انقلاب عظیم ہے، جو ہررات زمین والوں کواتھل پتھل کرر کھ دیتا ہے، اگرکسی نے صرف دن ہی دیکھا ہو، رات کبھی نہ دیکھی ہو، اس کے سامنے اگررات کے اس انقلاب کوذکر کیا جائے، تو اتنا تعجب کرے گا کہ کافر قیامت کے بارے میں اس کاعشرِعشیر بھی نہیں کرتا۔

رات کے عجائبات میں سے یہ بھی ہے کہ بہت سی دور کی چیزیں جودن کی روشنی میں نظر نہیں آتیں وہ رات کونمودار ہوجاتی ہیں، جیسے ستارے، چاندوغیرہ اور جوچیزیں قریب ہیں اوردن کونظر آتی ہیں، وہ رات کی تاریکی میں غائب ہوجاتی ہیں، جیسے زمین کی چیزیں ہیں۔

بہت سی ظاہر چیزوں کے پوشیدہ ہونے اور بہت سی پوشیدہ چیزوں کے ظاہر ہونے میں دنیا وآخرت کے درمیان جوفرق ہے، یہ دن رات بالکل اس کی مثال ہے، اسی لیےاس بات کی تکمیل وتتمہ کےطور پرآگےفرماتے ہیں:

وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ ۝

اورصبح کی جب دم بھرے

یعنی قسم ہے صبح کی جس وقت وہ سانس لیتی ہے، اس وقت بھی ایک انقلاب عظیم ظاہر ہوتا ہے، لوگ نیند سے بیدار ہوجاتے ہیں، قوائے حیوانیہ کے اندرفرحت وسرور کی لہر دوڑ جاتی ہے، بازار ومجالس پھر سے آباد ہوجاتے ہیں، لوگ تلاش معاش میں سرگرداں ہوجاتے ہیں، قافلے ولشکر پہاڑوں

کی طرح رواں دواں ہوجاتے ہیں، ہر چیز ظاہر روشن ہوجاتی ہے، مگر روشن ستارے بے نور اور پوشیدہ ہوجاتے ہیں۔

صبح کی طرف تنفس کی نسبت کرنے میں عجیب استعارہ ہے:

''صبح کا سانس لینا'' یہ دراصل کنایہ ہے سورج ظاہر کرنے کی طرف، صبح علامت ہے اس کے ظاہر ہونے پر، کنایہ اس طرح ہے کہ سورج کو تشبیہ دی ہے سمندر کے اندر تیرتی ہوئی مچھلی سے، جو پانی کے اندر نظروں سے اوجھل تیرتی ہوئی چلی جاتی ہے اور اس کے سانس لینے سے پانی منتشر ہوتا ہے اور اڑتا ہوا نظر آتا ہے، سورج کے طلوع ہونے سے پہلے صبح کے وقت یہی کیفیت ہوتی ہے، سورج ابھی طلوع نہیں ہوا ہوتا مگر روشنی کی لہریں پھوٹ پھوٹ کر عالم کو روشن کرتی جاتی ہیں، یہی لہریں جو دھوپ سے پہلے ظاہر ہوتی ہیں ان کو سمندر میں اڑتے ہوئے پانی سے تشبیہ دی ہے، جو مچھلی کے سانس لینے سے اڑتا اور منتشر ہوتا چلا جاتا ہے، مچھلی بھی پانی کے اندر ہوتی ہے اسی طرح سورج بھی ابھی نگاہوں سے اوجھل ہوتا ہے۔

بعض نے کہا ہے، کہ صبح کا سانس لینا یہ کنایہ ہے نسیم صبح سے، یہ ایک ہوا ہوتی ہے جو بہار کے دنوں میں چلتی ہے، تو نسیم کو سانس سے تشبیہ دی ہے، اس لیے کہ اس کی وجہ سے لوگ راحت وسکون محسوس کرتے ہیں، گویا صبح بھی ایک مریض اور غمگین شخص تھا، جس نے اب راحت کا سانس لیا ہے۔

صبح کی طرف سانس لینے کی نسبت کرنا عربی اور فارسی شعراء کے کلام میں مشہور ومعروف ہے، کوئی اجنبی بات نہیں ہے۔

عَسْعَسَ کی تحقیق وتفسیر:

عَسْعَسَ کا لفظ اضداد میں سے ہے، یعنی اس کا معنی آنا بھی ہوتا ہے اور جانا بھی، مثلاً یہاں ''**والّیل اذا عسعس**'' کا ترجمہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ''قسم ہے رات کی جب پھیلنے لگے'' یعنی آئے، اور یہ ترجمہ بھی ہوسکتا ہے ''قسم ہے رات کی جب ڈھلنے لگے'' یعنی جانے لگے، اور دونوں معنوں کی یہاں مناسبت موجود ہے، اگر اس لحاظ سے دیکھیں کہ اس کے مقابلے میں آگے صبح اور اس کے تنفس کا ذکر ہے اور یہ دن کی ابتدا کا وقت ہوتا ہے، لہذا مقابلے کی رعایت کرتے ہوئے ''**عسعس**'' کا معنی رات کے پھیلنے سے کرنا مناسب ہے، اس لیے کہ یہ رات کی ابتدا ہونے کا وقت ہے۔

اور اگر اس لحاظ سے دیکھیں کہ جب رات جاتی ہے تو صبح آتی ہے، لہذا ایک کے آنے سے دوسرے کا جانا لازمی ہے، اس اعتبار سے ان کے درمیان تلازم ہے، اس صورت کے مناسب یہ ہے کہ "**عسعس**" کا معنی جانے اور ڈھلنے سے کیا جائے، اس لیے کہ اس کے متصل بعد صبح کے آنے کا ذکر ہے۔

یہ کلام اللہ کا کمال اعجاز ہے کہ ایسے ذو وجہین مقام کے لیے لفظ بھی ایسا ارشاد فرمایا جو مشترک بین الضدین ہے، البتہ دوسرے معنی یعنی جانا اور ڈھلنا کرنے کی صورت میں یہاں صرف ایک ہی انقلاب کا ذکر ہوگا، کیونکہ رات کا جانا اس انقلاب کی ابتدا ہے اور صبح کا تنفس اس کی انتہا ہے (جب کہ پہلے معنی کی صورت میں دونوں آیتوں میں دو انقلاب کا ثبوت ہوتا ہے ایک رات جو مستقل ایک انقلاب ہے، دوسرا صبح کا آنا جو مستقل اپنے اندر ایک انقلاب رکھتا ہے)

دن کا آنا ایک ایسا انقلاب ہے جو انقلابِ آخرت سے کامل مشابہت رکھتا ہے، اس لیے کہ یہ نمونہ ہے حیات بعد الموت کا (گویا رات موت کے مشابہ ہے اور اس کے بعد دن کا آنا موت کے بعد کی زندگی کے مشابہ ہے) پھر وہ چیزیں جو رات کی تاریکی میں چھپی رہتی ہیں وہ دن کی روشنی میں بالکل ظاہر ہو جاتی ہیں، اس لیے اس پر اکتفا کرنا بہت ہی مناسب ہے (آخرت میں بھی ہر نیکی اور برائی جو دنیا میں لوگوں سے مخفی ہے ظاہر ہو جائے گی، لہذا اس انقلابِ یومی کو انقلابِ آخرت سے کامل مشابہت ہے)

بارہ حوادث میں حکمت اور ان کے وقوع کا عقلاً امکان:

اصل غرض یہاں پر یہ ہے کہ قیامت کے جن بارہ انقلاب و حوادث کا ذکر سورت کے شروع میں بیان ہوا ہے اور جن کے واقع ہونے کے بعد انسان پر خیر و شر کی حقیقت کھل جائے گی، بتلانا یہ ہے کہ ان حوادث سے ملتے جلتے حوادث و انقلابات دنیا میں بھی رونما ہوتے رہتے ہیں، صرف غور و فکر کی ضرورت ہے، لہٰذا ان حوادث کے واقع ہونے کو یقینی بتانے کے لیے قسم کھانے کی ضرورت نہیں، اس لیے کہ ان کا ممکن ہونا دلیلِ عقل سے ثابت ہو گیا۔

اور ان حوادث کا انسان کے لیے خیر و شر کی حقیقت کھلنے کا سبب ہونا عقل کے لیے ظاہر ہے بشرطیکہ غور و فکر کیا جائے۔ دوسری وجہ قسم کھانے کی حاجت نہ ہونے کی یہ ہے کہ عقل کا یہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ

مخبرِ صادق اگر کسی ایسی شئ ممکن کے وقوع کی خبر دے جو سبب ہو کسی اور خبر کا، تو اس کا علم یقینی حاصل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قسم کی حاجت نہ ہونے پر آگے اس کی علت و وجہ خود بیان فرما رہے ہیں چنانچہ فرمایا:

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝

مقرر یہ کہا ہے ایک بھیجے ہوئے عزت والے کا

"**انــه**" تحقیق یہ قرآن، جو اپنے دامن میں قیامت کی خبروں کو سمیٹے ہوئے ہے "**لـقـول رسول**" یہ اللہ کے قاصد کی لائی ہوئی بات ہے، جو اس نے اللہ کی طرف سے پہنچائی ہے، لہٰذا اس کے جھوٹ یا من گھڑت ہونے کی کوئی گنجائش نہیں ہے، کیونکہ اللہ کا کلام قطعی الصدق ہے یعنی اس کا سچا ہونا یقینی ہے۔

قرآن کے کلام اللہ ہونے پر شبہہ کا جواب:

اگر کسی کو یہ شبہہ ہو کہ اللہ کا کلام براہِ راست ہم تک نہیں پہنچا کہ ہمیں اس کے بارے میں کلام اللہ ہونے کا یقین ہو، یہ تو ہم تک واسطے کے ذریعہ سے پہنچا ہے، اور سند ثابت نہیں ہے، لہٰذا یقین کیسے کیا جاسکتا ہے؟

جواب: ہم کہتے ہیں کہ یہ قرآن جو تم پیغمبر علیہ السلام سے براہِ راست سنتے ہو، یہ اللہ تعالیٰ سے تم تک دو واسطوں سے پہنچا ہے، دو سے زیادہ واسطے نہیں ہیں، پہلا واسطہ تو وہ شخص ہے جو اللہ کی طرف سے پیغمبر تک یہ قرآن پہنچاتا ہے، دوسرا واسطہ خود پیغمبر علیہ السلام ہیں، ان دونوں واسطوں میں ثقاہت و اعتماد کے اعتبار سے کیا کمی ہے؟ ان کے عادل ہونے میں کیا شبہہ ہوسکتا ہے؟ خود غور کرلو، دیکھو پہلا واسطہ جو اللہ اور رسول کے درمیان ہے اس کی یہ صفات ہیں:

"کریم" وہ بہت عزت و مرتبہ والا ہے۔ اس کی عدالت و تقویٰ انتہائی درجے کے ہیں، اس لیے کہ عزت و مرتبہ تقویٰ کے بغیر نہیں ہوسکتا، چنانچہ حدیث میں آتا ہے: "**الـكــرم التـقـوىٰ والـحسـب المال**" اور قرآن میں بھی اسی طرف اشارہ موجود ہے: "**ان اكـرمـكـم عـنـدالله اتقاكم**" لہٰذا اس کا جو پہلا واسطہ اور راوی ہے اس میں عدالت و تقویٰ تو موجود ہے۔

اب اگر اس کی قوتِ حافظہ معلوم کرنا چاہتے ہو تو دوسری صفت اس کی یہ ہے:

ذِیْ قُوَّۃٍ

قوت والا

یعنی اس کے حافظے اور یادداشت میں کوئی خلل نہیں ہے، جو بات سنتا ہے بغیر کسی کمی بیشی کے اس کو یاد رہتی ہے اور اسی طرح پوری پوری بات آگے پہنچادیتا ہے، اگر چہ یہاں پر جبرئیل علیہ السلام کی قوت حافظہ اور قوتِ بیانیہ کو بیان کرنا مقصود ہے، مگر ان دونوں قوتوں میں کمال علی الاطلاق حاصل نہیں ہوتا، اس لیے ان کو یہاں مطلق قوت کے ساتھ موصوف کردیا ہے۔

جبرئیل علیہ السلام کی قوت:

حدیث میں آتا ہے ایک دن پیغمبر علیہ السلام نے حضرتِ جبرئیل علیہ السلام سے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے آپ کی بڑی بڑی صفات بیان فرمائی ہیں، آپ کی قوت وامانت کی بڑی تعریف کی ہے، اپنی قوت وامانت کا کچھ حال تو ہم سے بیان فرمایئے، انھوں نے کہا قوت میرے اندر اتنی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے قومِ لوط علیہ السلام کو برباد کرنے کا حکم فرمایا، اس قوم کے چار شہر تھے، ایک شہر کا نام ''سدوم'' تھا، اس میں بچوں، عورتوں کے علاوہ لڑائی کے قابل مردوں کی تعداد چار لاکھ تھی، میں نے ان چاروں شہروں کو صرف ایک پَر کے ذریعہ ساتوں زمین کی تہہ سے اٹھایا اور اتنا اوپر لے گیا کہ آسمان کے رہنے والوں نے ان کے مرغوں اور کتوں کی آوازیں سنیں، پھر میں نے ان کو الٹ کر اسی گڑھے میں پھینک دیا، اس کے باوجود مجھے کچھ تکلیف یا بوجھ محسوس نہیں ہوا۔

اور میری امانت داری کا یہ حال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کبھی کسی کام کی ذمہ داری مجھے نہیں سونپی مگر میں نے بلا کم وکاست اسے پورا کیا، جب بھی کوئی مجھے راز دیا گیا میں نے اسے پوشیدہ رکھا۔

ان دو صفات کے بیان کرنے سے روایت کی دو شرطیں یعنی عدالت اور قوتِ حفظ ثابت ہوگئی ہیں، اب ان کے علاوہ دیگر صفات ان کی بیان فرماتے ہیں۔

روایات کے درمیان ترجیح کا اصول:

چونکہ یہ صفات بھی ایسی ہیں کہ اسناد وروایات کے علم میں جانچ پرکھ رکھنے والے لوگ روایات کے درمیان ترجیح دیتے وقت راوی کے اندر ان صفات کا اعتبار کرتے ہیں، چنانچہ ان میں

سے ایک صفت یہ بھی ہے جو آگے جبرئیل امین کی بیان فرمارہے ہیں:

عِنۡدَذِی الۡعَرۡشِ مَکِیۡنٍ ۝

عرش کے مالک کے پاس درجہ پانے والا

راوی کے قابل اعتماد ہونے کی وجوہات:

ظاہر ہے جو آدمی ہر وقت بادشاہ کے دربار میں حاضر رہتا ہو، بادشاہ کے ہاں اس کا خاص مرتبہ ومقام بھی ہو، جب بادشاہ کا کوئی پیغام وہ پہنچائے تو اس میں زیادہ اعتماد ہوگا بہ نسبت اس آدمی کے پیغام کے جو ہر وقت حاضرِ دربار نہیں رہتا یا عام درباری اور عہدہ دار ہے۔

اس مقربِ خاص کے پیغام میں زیادہ اعتماد ہونے کی دو وجہیں ہیں۔

ا:- پہلی وجہ یہ ہے کہ وہ مقرب آدمی بادشاہ کا کلام براہِ راست بغیر کسی واسطے کے سنتا ہے، اس لیے اس بات میں یہ اندیشہ نہیں کہ کسی دوسرے نے بات اس تک پہنچانے میں شاید کچھ کمی بیشی کردی ہو۔

۲:- دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ شخص اپنے منصب ومرتبے کے وقار کو بحال رکھنے کے لیے پیغام پہنچانے میں انتہائی احتیاط سے کام لے گا۔

یہی وجہ ہے کہ امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، امام مالک اور دیگر ائمہ حدیث، روایات کے درمیان ترجیح دیتے وقت اور روایات میں جب اختلاف واضطراب پیدا ہوجائے تو اُن رُواتِ حدیث کی روایات کو ترجیح دیتے ہیں، جو راوی اپنے استاد وشیخ کی صحبت میں پابندی اور ہمیشگی کے ساتھ رہا ہو اور جن کی عزت وقدر استاد وشیخ کے ہاں زیادہ تھی۔

عام اہلِ دنیا کا عرف ورواج بھی یہی ہے کہ جب بادشاہ کا کوئی وزیر یا امیر اس کا کوئی پیغام پہنچائے تو اس کو زیادہ معتبر سمجھتے ہیں، لیکن کوئی عام سرکاری عہدہ دار اگر کوئی پیغام پہنچاتا ہے تو اتنا اعتبار نہیں کرتے۔

اور جبرئیل علیہ السلام بھی اللہ کے دربار میں ایسے ہی ہیں، لہٰذا ان کے ذریعہ پہنچنے والے پیغام میں کیا شبہہ ہوسکتا ہے۔

مُطَاعٍ ثَمَّ اَمِیۡنٍ ؕ

سب کا مانا ہوا وہاں کا معتبر ہے

وہ عالمِ بالا جو مملکتِ الٰہیہ کی کسوٹی ہے، جبرئیل کی اس عالم میں اطاعت وفرمانبرداری کی جاتی ہے، عالمِ بالا کے تمام اراکین کسی تحقیق کے بغیر اس کی ہر بات مانتے ہیں، اور یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ کا ہی حکم ہوگا، یہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے، اس دربارِ عالی کے ہر فرد کے ذہن میں یہ بات جم چکی ہے کہ جبرئیل نمائندۂ خاص ہیں، چنانچہ معراج کی رات جب آنحضرتﷺ کو اپنے ساتھ لے کر گئے تو آسمان کے، اور جنت ودوزخ کے دربانوں نے ان کے حکم سے دروازے کھول دیئے، نبی کریمﷺ جہاں چاہتے سیر کرتے تھے، معراج کی احادیث میں اس کا مفصل بیان موجود ہے۔

ساتوں آسمان والوں کو ہمیشہ احکامِ الٰہی وہی پہنچاتے ہیں، گویا اللہ کا پیغام پہنچانے کی خاص صفت میں جبرئیل فرشتوں میں مشہور ومعروف ہیں، ان کا آنا علامت ہوتی ہے اس بات کی کہ وہ ضرور اللہ کا کوئی پیغام لائے ہیں۔

جب راوی اس قدر ثقہ اور بااعتماد ہو کہ تمام ثقات اس کی روایت کو قبول کرتے ہوں اور اس سے سند کا مطالبہ نہ کرتے ہوں، تو پھر بھی جھوٹ یا بناوٹ کا احتمال نکالنا مالیخولیا کے سوا کچھ نہیں۔

اس کلام اللہ میں دوسرا واسطہ تمہارا پیغمبر ہے، وہ ایسا شخص ہے کہ چالیس سال تک تمہارے درمیان رہا، خلوت وجلوت میں اس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، اپنے پرائے کسی نے اس سے جھوٹ کا تجربہ نہیں کیا، پھر ایسے آدمی کی خبر پر اعتبار نہ کرنا بالکل خلافِ عقل بات ہے۔

ہاں اگر یہ شبہہ ہو کہ شاید وہ سودائی اور خفقانی آدمی ہے، اندرونی حواس کے اندر خرابی پیدا ہو جانے کی وجہ سے عجیب وغریب خیالات اس کے دل ودماغ میں گردش کرتے ہیں، جن کی کوئی حقیقت نہیں، حواسِ باطنہ میں خلل کی وجہ سے اس کو عجیب وغریب آوازیں سنائی دیتی ہیں اور جو کچھ خیال میں آتا ہے اس کو واقعی سمجھتا ہے۔ اس شبہے کی بھی یہاں کوئی گنجائش نہیں ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

وَمَا صَاحِبُکُمۡ بِمَجۡنُوۡنٍ ؕ

اور یہ تمھارا رفیق کچھ دیوانہ نہیں

یعنی تمہارا ہم نشین یہ جلیل القدر پیغمبر کوئی سودائی اور خیالی قسم کا آدمی نہیں ہے کہ اس کی خبر کو دیوانگی کا اثر سمجھنے لگو، اس لیے کہ یہ تمہارا ساتھی ہے، ایک طویل عرصہ تک تمہاری آپس میں رفاقت وصحبت رہ چکی ہے، اس کی عقل ودانائی کا بار بار تم تجربہ کر چکے ہو، تمہیں اس بات کا بھی اچھی طرح تجربہ ہو چکا ہے کہ ان کے حواس، فہم وادراک اتنا سلیم، کامل اوراعلیٰ ہے کہ تمام عقلاء ان کے سامنے ہیچ ہیں، لہٰذا پھران کی خبر کے حق وسچ ہونے میں کیا شبہہ باقی رہ جاتا ہے؟

لیکن ان سب باتوں کے باوجود اگر کسی کے دل میں یہ شبہہ گذرے کہ پیغمبر علیہ السلام کسی صورت کا مشاہدہ کرتے ہیں، اس کی زبانی اللہ کا کلام سنتے ہیں، اب ہمیں کیسے یقین ہو کہ یہ صورت جبرئیل کی ہے، ممکن ہے کوئی جن یا شیطان فریب کرتا ہو، اور پیغمبر اس کو جبرئیل سمجھ رہے ہوں؟

ہم کہتے ہیں کہ یہ شبہہ اس وقت درست ہوتا جب پیغمبر علیہ السلام نے کبھی جبرئیل امین کو اصلی شکل میں نہ دیکھا ہوتا، حالانکہ ایسا نہیں ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِیْنِ ۝

اور اُس نے دیکھا ہے اُس فرشتہ کو آسمان کے کھلے کنارے کے پاس

یعنی پیغمبر نے جبرئیل کو اس کی اصلی شکل میں اُفقِ شرقی پر دیکھا ہے اور چونکہ اس جانب سورج ہوتا ہے اس لیے اس طرف دیکھنے میں کوئی شک وشبہہ نہ رہا، اور جب کسی چیز کی حقیقت ایک بار دیکھ لی جائے اور اس کو پہچان لیا جائے تو پھر چاہے وہ حقیقت جس صورت ولباس میں بھی آئے پہچاننا آسان ہوتا ہے، جیسے کوئی بچہ اگر دریا دیکھے پھر ایک پیالے میں پانی لا کر اس کو دکھایا جائے تو وہ دیکھتے ہی پہچان لے گا کہ یہ وہی چیز ہے، اسی طرح جب آنحضرت ﷺ نے جبرئیل کو ان کی اصلی شکل میں دیکھا تو ان پر حقیقتِ جبرئیلیہ منکشف ہوگئی، اس کے بعد جبرئیل کو وہ ہر صورت ولباس میں دیکھ کر پہچان لیتے تھے ؎

تو خواہی جامہ خواہی قبا پوش
بہر رنگے تُرا من می شناسم

ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جبرئیل کو پہچان نہ سکنے کی وجہ؟

البتہ ایک بار جبرئیل اجنبی آدمی کے بھیس میں آئے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دین کے مسائل پوچھے تھے، اس وقت آنحضرت ﷺ فوراً ان کو پہچان نہیں سکے تھے، وہ اس وجہ سے کہ جبرئیل نے اپنی حقیقت سے نزول کرلیا تھا، جبرئیل کی حقیقت اللہ کی رسالت ونمائندگی کی ہے، اس وقت انھوں نے اس سے تنزل کیا اور ایک سائل کی شکل میں ظاہر ہوئے تھے، اور چونکہ ان کا یہ آنا وحی پہنچانے یا احکام الٰہی پہنچانے کے لیے نہیں تھا کہ حضور ﷺ پر ان کی حقیقت منکشف ہوجاتی، اس لیے آپ ﷺ ان کو نہ پہچان سکے۔

جبرئیل کو اصلی شکل میں دیکھنے کا ذکر:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے جبرئیل کو دو بار اصلی شکل میں دیکھا، پہلی مرتبہ وحی کے شروع زمانے میں دیکھا، جب میں بے چین ہوکر چاہتا تھا کہ اپنے آپ کو پہاڑ پر سے گرادوں، اسی کیفیت میں، میں جارہا تھا، مکہ معظّمہ میں مقامِ جیاد پر میں نے جبرئیل کو اصلی شکل میں دیکھا، دیکھتا ہوں زمین وآسمان کے درمیان سونے کی ایک چمکتی ہوئی معلق کرسی پر مشرق کی طرف رُخ کیے ہوئے بیٹھے ہیں، انتہائی خوبصورت نورانی شکل ہے، اور جسم اتنا بڑا کہ آسمان کے دونوں کنارے ان کے جسم سے پُر تھے، چھ سو ان کے پر تھے، جو سب کے سب یاقوت اور موتیوں کے تھے۔

دوسری بار شب معراج میں سدرۃ المنتہیٰ کے پاس بھی اسی شکل میں دیکھا۔

افقِ ’’اعلیٰ‘‘ اور افقِ ’’مبین‘‘ کی حقیقت:

سورۂ نجم کے شروع میں دونوں بار دیکھنے کا ذکر ہے، البتہ وہاں پہلی بار دیکھنے کے متعلق فرمایا کہ جبرئیل کو ’’افقِ اعلیٰ‘‘ میں دیکھا اور اس سورت میں اسی کے متعلق یہ فرمایا کہ ’’افقِ مبین‘‘ پر ان کو دیکھا، عبارت کے اسلوب میں اس تغیر میں نکتہ یہ ہے، کہ اس سورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر کی سچائی اور اس کے صاف واضح ہونے کو بیان کرنا مقصود ہے، لہٰذا اس مقام کے مناسب لفظ مبین تھا (کہ اس کا معنی بھی صاف واضح ہے) اور سورۂ نجم کے اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام ومرتبہ کی بلندی، اور ان کا آسمان کے طبقات اعلیٰ کی طرف جانا بیان کرنا مقصود تھا اور اس مقام کے مناسب ’’لفظ اعلیٰ‘‘ تھا، اس لیے اس کو وہاں ذکر کردیا۔

نیز یہ بات بھی ہے کہ سورۂ نجم میں جبرئیل کے متعلق فرمایا "فاستوىٰ وھو بالافق الاعلیٰ" وہ سیدھا ہوا، اور وہ افقِ اعلیٰ میں تھا، یہ "استویٰ" دراصل حقیقتِ جبرئیلیہ کی تجلی سے کنایہ ہے، اس کی ابتداء ایسی صورت میں ہوئی کہ حقیقتِ جبرئیلیہ کا مقتضاء افقِ اعلیٰ میں تھا اور اس کی انتہا وقرب افقِ مبین میں۔

بعض محققین نے کہا ہے کہ عالم مثال کے دو افق ہیں، ایک اُفقِ اعلیٰ، دوسری اُفقِ ادنیٰ، افق اعلیٰ عالم تجرّد وتقدس کے ساتھ ملی ہوئی ہے، اور افقِ ادنیٰ عالم شہادت (شہود) کے ساتھ ملی ہوئی ہے، جب جبرئیل امین نے چاہا کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے ایسی شکل میں ظاہر ہوں، جو ان کے کمالات کے مناسب ہے تو سب سے پہلے وہ جسمِ مثالی کے لباس میں افقِ اعلیٰ میں ظاہر ہوئے، پھر آہستہ آہستہ نزدیک ہوتے گئے، یہاں تک کہ عالم شہود کے کنارے افقِ مبین تک پہنچ گئے، پھر بڑھتے بڑھتے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مل گئے اور اتصالِ تام کرلیا۔

لہٰذا افقِ مبین سے مراد یہ ہے کہ وہ اس حقیقت کو واضح کرنے والی تھی، آسمان کا کنارہ مراد نہیں، گویا استعارے کے طور عالم مثال کے ان دونوں کناروں کو افق سے تعبیر کردیا (ہم جس کو افق کہتے ہیں وہ یہاں مراد نہیں) عالمِ مثال کے کناروں کو افق سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ غیب کے جتنے بھی عالم ہیں، وہ اہل کشف وشہود کو اکثر دائروں کی شکل میں نظر آتے ہیں، سورۂ نجم کے اندر قرآن کا اسلوب بھی اسی تقریر کی تائید کرتا ہے۔

جب قرآن کریم کے کلام اللہ ہونے کے متعلق تمام شبہات ختم ہوگئے، تو اب اس کو اللہ کی طرف منسوب کرنے میں جھوٹ کا کوئی احتمال باقی نہ رہا، البتہ بعض کفار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کاہن ہونے کا شبہہ کرتے اور قرآن کو کہانت سمجھتے تھے، اس لیے اس شبہہ کا ازالہ بھی ضروری ہوا۔

(جاری ہے)

الازہارالمربوعہ

محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ

امام نسائی اور امام ابوداؤد صاحب سنن نے حدیث مسلم کو دوسری حدیث سے منسوخ قرار دیا ہے

اس بحث کے آخر میں یہ بتا دینا بھی مناسب ہوگا کہ امام ابوداؤد نے -جن کی سنن صحاح ستہ میں داخل ہے- حدیث مسلم کو ایک دوسری حدیث سے منسوخ قرار دیا ہے، اور اس کا ذکر خود علامہ ابن القیم نے اغاثۃ اللہفان میں کیا ہے، اور چونکہ یہ بات موصوف کے خلاف ہے، اس لیے ابوداؤد کا جواب دینے کی بھی کوشش کی ہے، لیکن علامہ موصوف کی یہ کوشش ناکام رہی۔ اگر مجیب صاحب نے علامہ موصوف کی وکالت کی ہمت کی، تو ہم اس ناکامی کا ناقابل تردید ثبوت دینے کے لیے تیار ہیں۔ اور جس ترجمۃ الباب کی بنا پر ابن القیم نے ابوداؤد کو قائل نسخ قرار دیا ہے، وہی ترجمۃ الباب وحدیث سنن نسائی میں بھی موجود ہے، لہٰذا امام نسائی بھی حدیث مسلم کے منسوخ ہونے کے قائل ہیں۔

میں نے اعلام میں لکھا تھا:

خامساً: — اس روایت کا مدار طاؤس پر ہے اور ان کی نسبت علامہ ابوجعفر بن النحاس نے کتاب الناسخ والمنسوخ میں لکھا ہے کہ طاؤس اگرچہ مرد صالح ہیں مگر ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ان کی کئی روایتیں منکر ونامقبول ہیں (اعلام ص ۱٦)

صاحب آثار لکھتے ہیں:

''علامہ ابوجعفر نے ہرگز ابوالصہباء والی روایت کو مناکیر طاؤس میں سے نہیں شمار کیا ہے الخ''۔

جواب: — ناظرین مجیب صاحب کی بدحواسی ملاحظہ کریں اور میری مذکورہ بالا عبارت ایک بار پھر پڑھ کر بتائیں کہ میں نے یہ کہاں لکھا ہے کہ علامہ ابوجعفر نے ابوالصہباء کی روایت کو منکر کہا ہے جو مجیب صاحب اس کی تردید کے درپے ہو رہے ہیں، اور جب میں نے یہ نہیں لکھا ہے تو حاشیہ میں

اس پر غلط بیانی کا عنوان قائم کرنا خود غلط بیانی ہے یا نہیں۔

صاحب آثار لکھتے ہیں:

''میں اپنے دوست مؤلف سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کئی روایتوں کے منکر ہونے سے یہ کیسے لازم آ گیا کہ ابوجعفر صحیح مسلم کی حدیث کو بھی منکر کہتے ہیں اور اگر یہ آپ کا اجتہاد ہے کہ ابوجعفر نے چونکہ طاؤس کی کئی روایتوں کو منکر کہا ہے لہٰذا مسلم کی روایت بھی منکر ہوگئی تو اس کو صاف صاف لکھئے تاکہ آئندہ واضح طور پر اس اجتہاد کی داد دی جا سکے۔ اور یہ بھی لکھئے کہ کسی راوی کی ایک یا چند روایتوں کے منکر ہونے سے اس کی تمام روایتیں منکر ہو جاتی ہیں یا نہیں۔

جواب:- اولاً مجھ سے یہ پوچھنا مجیب کی عقلمندی ہے، اس لیے کہ میں نے اس لزوم کا دعویٰ نہیں کیا اور نہ میں نے طاؤس کی کئی روایتوں کے منکر ہونے سے مسلم کی روایت کے منکر ہونے کو سمجھا۔ کیا مجیب صاحب میرے الفاظ سے ان دونوں باتوں کا کوئی ثبوت پیش کر سکتے ہیں۔

ثانیاً:- میں مجیب سے پوچھتا ہوں کہ اگر طاؤس کی کئی روایتوں کے منکر ہونے سے حدیث مسلم کا -جس کے راوی طاؤس ہیں- منکر ہونا لازم نہیں آتا تو کیا کسی قسم کا کوئی اور ضعف کسی درجہ کا بھی لازم نہیں آتا۔ اگر کہئے کہ لازم آتا ہے تو اس کا کیا جواب آپ نے دیا؟ اور اگر کہئے کہ کسی قسم کا ضعف نہیں لازم آتا تو سلمہ بن الفضل کی نسبت جو ہماری حدیث پنجم کا راوی ہے آپ نے آثار ص ۹۷ میں امام بخاری کا قول **عنده مناكير** (سلمہ کی کئی روایتیں منکر ہیں) کیوں نقل کیا؟ آخر اس کی کیا وجہ کہ سلمہ کی کئی روایتوں کے منکر ہونے سے ہماری حدیث پنجم تو ضعیف ہو جائے، اور طاؤس کی کئی روایتوں کے منکر ہونے سے آپ کی حدیث مسلم ضعیف نہ ہو؟ آپ کو یاد ہوگا کہ ابوجعفر نے بھی طاؤس کی نسبت وہی لفظ استعمال کیا ہے جو بخاری نے سلمہ کی نسبت فرمایا ہے، بلکہ ابوجعفر کا قول بخاری کے قول سے زیادہ واضح اور اس سے زیادہ موکد ہے (دیکھو اعلام ص) بہرحال اب پہلے آپ اپنے ہی اجتہاد کی داد دیجئے اور آپ ہی پہلے لکھئے کہ راوی کی ایک یا چند روایتوں کے منکر ہونے سے اس کی تمام روایتیں منکر (یا ضعیف) ہو جاتی ہیں یا نہیں۔

ثالثاً:- **عنده مناكير** کا ترجمہ آپ کی تحقیق میں منکر الحدیث ہے (دیکھئے آثار ص ۹۷) اور مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری نے ابکار المنن میں سخاوی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ منکر الحدیث راوی

..........منا کیر فرمایا ہے[۱] جس کا ترجمہ تین طلاقوں کو عبداللہ بن عباس ایک کہتے تھے'' مگر ناظرین یقین مانیں کہ **وما مواعیدہ الا الاباطیل** ۔میرے استدلال کی پوری بحث یعنی آثار کا باب دوم تمام وکمال پڑھ جائیں وہ دیکھیں کہ کہاں مجیب نے یہ وعدہ پورا کیا ہے۔

میں نے اعلام میں لکھا تھا:

سادساً:- روایت کا پورا مضمون غور سے پڑھئے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے خود اس کا جواب دے دیا ہے کہ کبھی کسی وجہ سے ایسا ہوتا تھا، لیکن حضرت عمرؓ کے زمانے میں اس کے خلاف پر اجماع ہو گیا لہٰذا اب تین طلاقوں کے بعد رجعت جائز نہیں ہے (اعلام ص ۱۶)

صاحب آثار نے پہلے مجھ کو دروغ گوئی اور دیانت کا خون کرنے کا الزام دیا ہے، اس کے بعد فرماتے ہیں ''اسی صفحہ ۱۶ میں مولف نے حدیث کا ترجمہ کیا ہے...... بتایا جائے کہ وہ کبھی کسی وجہ سے ایسا ہوتا تھا'' حدیث کے کس ٹکڑہ کا مطلب ہے؟......اسی طرح ''اس کے خلاف پر اجماع ہو گیا'' ابن عباس کے کن الفاظ سے نکلتا ہے، ابن عباسؓ کے الفاظ تو یہ ہیں ''جب لوگوں نے بکثرت طلاق دینا شروع کی تو حضرت عمرؓ نے تینوں کو نافذ کر دیا'' جن کا صاف اور کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے مصلحت وقت سے ایک حکم جو مناسب سمجھا نافذ کر دیا۔ دیگر صحابہ کا کوئی ذکر ہی نہیں فرماتے۔ خود سبب پر غور کیجئے۔ جب لوگوں نے بکثرت طلاق دینی شروع کی تو حضرت عمرؓ نے نفاذ کا حکم دیا۔ اگر لوگ ایسا نہ کرتے تو حضرت عمرؓ بھی تینوں کو نافذ نہ کرتے، معلوم ہوا کہ ایک وقتی حکم تھا جو ایک خاص سبب کی بنا پر دیا گیا۔

جواب:- میری بھی یہ استدعا ہے کہ ناظرین حدیث مسلم کے مضمون کو غور سے پڑھیں اور بتائیں کہ حضرت ابن عباسؓ نے ابوالصہبا کے جواب میں ہاں کہنے کے بعد یہ جو فرمایا ہے کہ ''لیکن جب لوگوں نے بکثرت طلاق دینا شروع کی تو حضرت عمرؓ نے تینوں کو نافذ کر دیا'' اس کا بجز اس کے اور کیا مطلب ہو سکتا ہے کہ تم جو بات کہتے ہو وہ کبھی کسی وجہ سے ہوتی تھی لیکن حضرت عمرؓ کے عہد میں تینوں طلاقیں نافذ ہونے لگیں۔ مگر مجیب صاحب نہ سمجھیں تو اس کا میرے پاس کیا علاج ہے۔

---

(۱) اس جلد کی اشاعت کے آغاز میں لکھا گیا تھا کہ کتاب کا اصل نسخہ مفقود ہے، اس کی فوٹو کاپی موجود ہے، اسی سے اس کتاب کو شائع کیا جا رہا ہے۔ اس مقام پر دو سطر کے بقدر عبارت کا فوٹو نہیں آسکا ہے، جس کی جگہ نقطے دے دیے گئے ہیں (ادارہ)

اب رہا ان کا یہ سوال کہ ''اس کے خلاف پر اجماع ہوگیا'' ابن عباس کے کن الفاظ سے نکلتا ہے؟ تو مجیب صاحب حضرت ابن عباسؓ کے یہ الفاظ پڑھیں: **فلما کان زمان عمر رضی اللّٰہ قال: یا ایھا الناس قد کانت لکم فی الطلاق أناۃ وانہ من تعمل أناۃ اللہ فی الطلاق ألزمناہ إیاہ** اور بعض الفاظ میں ہے **أجیزوھن علیھم.** حضرت ابن عباس کے یہ الفاظ دلالت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے لوگوں کے مجمع میں تین طلاقوں کے نافذ کرنے کا اعلان کیا تھا اور صحابہ کو بھی نافذ کرنے کا حکم دیا تھا۔ حضرت ابن عباسؓ یہ ساری باتیں ذکر کرتے ہیں، لیکن اس کا کچھ ذکر نہیں کرتے کہ اس مجمع میں یا اس کے بعد کسی نے حضرت عمرؓ کی مخالفت کی، پس حضرت ابن عباسؓ کا یہ انداز بیان صاف بتا رہا ہے کہ سب نے حضرت عمرؓ کی موافقت کی اور اس مسئلہ میں اجماع ہوگیا۔ اور حضرت ابن عباسؓ کے انداز بیان سے جو ثابت ہوتا ہے اس کی صریح سند فتاویٰ صحابہ سے ہوتی ہے، کہ جن صحابیوں کے فتوے اس مسئلہ میں ملتے ہیں ان سب میں تین طلاقوں کا واقع ہونا مذکور ہے۔

ہمارے اس بیان سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ حضرت عمرؓ کا حکم وقتی اور مصلحت وقت کی بنا پر نہ تھا، ورنہ صحابہ حضرت عمرؓ کے بعد اور اس وقت کے گذرنے پر حکم فاروقی کے مطابق کیوں فتویٰ دیتے، خصوصاً حضرت ابن عباس کہ وہی حضرت عمرؓ کے حکم کے راوی ہیں اور ان کو مجیب صاحب سے زیادہ بہتر طریق سے معلوم ہوگا کہ حضرت عمرؓ کا یہ حکم وقتی ہے، پھر انھوں نے حضرت عمرؓ کے بعد کیوں وقوع ثلاث کا فتویٰ دیا۔

علاوہ بریں حضرت عمرؓ کے حکم کا سبب کثرت سے طلاق دینا تھا (جیسا کہ مجیب صاحب تسلیم کر چکے ہیں) پس میں مجیب سے پوچھتا ہوں کہ کیا یہ ایسا سبب ہے جس سے حدیث مرفوع کی مخالفت جائز ہوسکتی ہے، اور جائز ہی نہیں، بلکہ مخالفتِ حدیث ایسے وقت میں بہتر وراجح ہے، اگر کہئے کہ ہاں تو گزارش ہے کہ آج بھی یہ سبب موجود ہے، لہٰذا حدیث ابن عباسؓ کی مخالفت اور اس کے خلاف فتویٰ دینے کو راجح و بہتر مانئے اور اس کا اعلان کیجئے۔ اور اگر کہئے کہ اس سبب سے حدیث مرفوع کی مخالفت جائز نہیں ہوسکتی، تو بتایئے کہ حضرت عمرؓ نے اس سبب سے حدیث کی مخالفت کیوں کی؟ اور اس کے خلاف وقتی حکم ہی سہی کیوں دیا؟ اور صحابہ نے اس مخالفت حدیث پر ان کی موافقت کیوں کی؟ اور حضرت عمرؓ کے بعد تک اس حدیث کے خلاف فتویٰ کیوں دیتے رہے؟ اگر صحابۂ کرام کی نسبت آپ ایسا فاسد عقیدہ رکھیں گے کہ وہ ایک حدیث مرفوع کی جو عہد نبوی وعہد صدیقی اور دو برس تک عہد

فاروقی میں برابر معمول بہ رہ چکی تھی، اس کی مخالفت اور اس کے خلاف علانیہ حکم دینے پر راضی ومتفق ہوجاتے تھے، تو آپ عدالت صحابہ کے مسئلہ کو درہم برہم کردیں گے اور دین کی ہر بات کو آپ مشتبہ ومشکوک بناڈالیں گے (**والعياذ بالله من هذه العقيدة الفاسدة**)

کوشش کیجئے تو مذکورہ بالا تقریر سے آپ کو امیر یمانی کے اس کلام کی رکاکت بھی سمجھ میں آسکتی ہے جس کو آپ نے انکار اجماع کی حجت میں پیش کیا ہے، امیر یمانی کے کلام کا حاصل یہ ہے کہ ''سکوت سے رضامندی واتفاق پر استدلال اس لیے غلط ہے کہ ممکن ہے دل میں ناگواری وانکار رہا ہو مگر زبان سے اظہار نہ کیا ہو''۔ مجھے افسوس ہے کہ امیر یمانی نے صحابہ کی نسبت یہ لکھا ہے تو انھوں نے صحابہ کی جرأت اعلانِ حق وصداقت کو قطعاً نظرانداز کرتے ہوئے ان کو اپنے زمانہ کے لوگوں پر کس طرح قیاس کیا، حالانکہ صحابہ کی نسبت خدا نے بتصریح فرمایا ہے **ولا یخافون لومة لائم** (وہ ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتے) نیز واقعات شاہد ہیں کہ صحابہ نے کسی موقع پر اپنے ضمیر اور حق کے خلاف کوئی بات ہوتے دیکھ کر یا سن کر سکوت نہیں کیا۔ نیز اظہار حق سے مانع وہاں ہوا کرتا ہے جہاں حکومت جائرہ ہو، حضرت عمرؓ خلیفۂ راشد کے سامنے کیا اندیشہ ہوسکتا ہے۔ پس حضرت عمرؓ کے حکم کو سن کر صحابہ کا سکوت بجز اس کے اور کسی بات کی دلیل نہیں ہوسکتا کہ ان کے نزدیک حضرت عمرؓ کا حکم بالکل حق تھا، اور کسی نص کے کسی طرح مخالف نہیں تھا، ورنہ لازم آئے گا کہ انھوں نے بلا کسی اندیشہ کے اور زبان سے انکار کی قدرت رکھتے ہوئے انکار نہیں کیا۔ جو نص قرآنی کے خلاف ہونے کے علاوہ عدالت صحابہ کے متفق علیہ مسئلہ کے بھی خلاف ہے۔

باقی امیر یمانی نے یہ جو فرمایا کہ ''خاموش رہنے والے کی طرف اتفاق یا اختلاف کسی چیز کو منسوب نہیں کیا جاسکتا''، تو اس کی تردید کے لیے خود حدیث ابن عباس کافی ہے، اس لیے کہ جب تک یہ نہ کہا جائے گا کہ تین کے ایک کرنے کی اطلاع آپ کو ہوتی تھی اور آپ سکوت فرماتے تھے، اور آپ کا سکوت فرمانا رضامندی واتفاق کی دلیل ہے، حدیث ابن عباسؓ سے استدلال ممکن نہ ہوگا، نیز سکوت کا دلیل رضا ہونا دوسری حدیثوں سے بھی ثابت ہے، پس امیر یمانی اور ان کے وکیل کو بتانا چاہئے کہ آیا کہیں پر بھی سکوت دلیل رضا نہیں ہوسکتا، یا ہوسکتا ہے تو کہاں کہاں ہوسکتا ہے؟ اور کہاں کہاں نہیں؟ اور جس صورت میں نزاع ہے وہ انھیں مقامات میں سے ہے جہاں دلیل نہیں بن سکتا ہے، تاوقتیکہ بادلیل اس کو بیان نہ کیا اس وقت تک امیر یمانی کا کلام کچھ مفید نہیں، بلکہ اس اطلاق کے ساتھ وہ سرے سے صحیح ہی نہیں ہے۔

اور مولانا عبدالحی رحمہ اللہ کا امیر یمانی کے کلام کو نقل کرنا اس کی دلیل نہیں ہے کہ ان کے نزدیک یہ کلام صحیح ہے، اس لیے کہ مولانا نے اس کلام کو الزاماً نقل کیا ہے۔ مولانا محمد بشیر سہسوانی اہلحدیث وامیر یمانی ہم مسلک ہیں، اور اول الذکر امیر یمانی کے بڑے معتقد، اس وجہ سے مولانا نے امیر یمانی کے کلام سے سہسوانی صاحب کا جواب دیا ہے۔ باقی مولانا کی جو اپنی تحقیق اجماع سکوتی کے باب میں ہے اس کو امیر یمانی کے کلام سے پہلے مولانا نے اسی کتاب السعی المشکور میں بدیں الفاظ لکھا ہے "اصولیین اجماع کی دو قسم کرتے ہیں ایک عزیمت وہ یہ کہ جملہ مجتہدین ایک عصر کے ایک حکم پر بطرز تکلم یا عمل وغیرہ اتفاق کریں، دوسرے رخصت وہ یہ کہ ایک مجتہد ایک حکم کا فتویٰ دیوے اور مجتہدین اس پر سکوت کریں اور خلاف ورد نہ کریں مگر یہ مشروط ہے اس امر کے ساتھ کہ خبر اس مجتہد حاکم کے حکم کی منتشر ہو کے بقیہ ائمہ کو پہنچی ہو اور زمانہ تامل واجتہاد کا بھی ان کو ملا ہو اور ان سے اس مسئلہ سے تعرض وسوال وغیرہ بھی کیا گیا ہو اور پھر انھوں نے اسی مجتہد حاکم کے حکم پر سکوت کیا ہو تو ایسا اجماع سکوتی بھی جمہور کے نزدیک حجت ہوتا ہے اور وہ مسئلہ اجماعیہ کہلاتا ہے" (ص ۶۸)

پس مولانا کی تحقیق کو چھوڑ کر اس عبارت کو نقل کرنا جس کو انھوں نے الزام مخالف کے لیے نقل کیا ہے، کھلا ہوا فریب ہے۔ اور امیر یمانی کے رکیک واضح البطلان کلام سے اس اجماع کی نفی کرنا جو آفتاب نصف النہار کی طرح واضح ہے، بجز فریب نفس کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ ان باتوں کے علاوہ اور جو باتیں مجیب صاحب نے اس بحث میں لکھی ہیں ان سب کا جواب ہم دے چکے ہیں، بعض باتوں کا بحث اجماع (۱) میں اور بعض کا اسی باب دوم (۲) میں، اس لیے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں یہاں پر مجیب نے بعض عبارات کتب فقہ سے حضرت عمرؓ کے حکم کا سیاسی ہونا ثابت کیا ہے، ان کی نسبت چند کلمے لکھتا ہوں۔

ناظرین کو معلوم ہونا چاہئے کہ مذہب حنفی میں جن ائمہ یا مشائخ کے اقوال قابل قبول ولائق اعتنا سمجھے جاتے ہیں، ان میں سے کسی ایک نے بھی حضرت عمرؓ کے حکم کو سیاسی نہیں کہا ہے۔ ہاں

(۱) آثار ص ۳۵ میں جو لطیفہ لکھا ہے اسی کو ص ۱۱۶ میں زیر نمبر ۲ لکھا ہے۔ اسی طرح حضرت عمرؓ کے حکم کو سیاسی وہاں بھی لکھا ہے اسی طرح حضرت عمرؓ کے حکم کے وقت جملہ مجتہدین کی موجودگی ثابت کرنے کا مطالبہ وہاں پر زیر نمبر ۷ کیا ہے، ان سب باتوں کا جواب وہاں ہو چکا ہے

(۲) جیسے مولانا عبدالحی وعلامہ آلوسی کی عبارتوں کی بحث ۱۲ منہ

مصنفین حنفیہ میں ایک مصنف قہستانی ہیں جنھوں نے نقایہ کی شرح جامع الرموز لکھی ہے، انھیں نے حضرت عمرؓ کے حکم کو سیاسی لکھا ہے۔لیکن ان کے مخصوص اقوال اور ان کی تصنیفات کو حنفیہ میں درجۂ اعتبار حاصل نہیں ہے، بلکہ محققین علمائے حنفیہ نے ان کی تصنیفات کو غیر معتبر کتابوں میں شمار کیا ہے، دیکھو مقدمہ عمدۃ الرعایہ ص ۱۱۱ اور النافع الکبیر ص ۱۱۸ اور شامی ج ا ص ۵۰۔

باقی قہستانی کے علاوہ اور جس حنفی مصنف نے اس کو لکھا ہے، اس نے قہستانی ہی کے حوالہ سے لکھا ہے، چنانچہ طحطاوی کے کلام میں قہستانی کے حوالہ کی تصریح مجیب نے ص ۳۴ میں نقل کی ہے، اسی طرح در المنتقی ص ۳۸۲ میں بھی اس کی صراحت موجود ہے، الحاصل یہ تنہا قہستانی کا قول ہے، جو کسی طرح قابل اعتبار نہیں ہے۔

میں نے اعلام میں لکھا تھا:

سابعاً: — علامہ قرطبی نے فرمایا ہے کہ یہ روایت مضطرب ہے (فتح الباری ص ۲۹۲)

صاحب آثار لکھتے ہیں:

"مولف اس کے اضطراب کو بقاعدہ اصول حدیث ثابت کریں، اور یہ بتائیں کہ اضطراب اگر ہے تو قادح ہے یا غیر قادح؟

جواب: — مجیب صاحب کی حواس باختگی کی اس سے بڑھ کر کیا دلیل ہوسکتی ہے کہ صاف صاف واضح طور پر لکھا ہوا دیکھتے ہیں اور اپنے قلم سے نقل بھی کرتے ہیں کہ اس روایت میں اضطراب کے مدعی علامہ قرطبی ہیں، ان کا خصم مولفِ اعلام قرطبی کا ناقل ہے، لیکن پھر بھی اضطراب کا ثبوت مولفِ اعلام سے مانگتے ہیں۔ مجیب صاحب کو فن مناظرہ کا یہ معمولی مسئلہ بھی معلوم نہیں ہے کہ ناقل سے دلیل اور ثبوت کا مطالبہ جائز نہیں ہے۔ صرف تصحیح نقل کا مطالبہ اس سے کیا جاسکتا ہے اور میں فتح الباری میں قرطبی کا قول دکھانے کے لیے ہمہ وقت تیار ہوں۔ مجیب اور ان کے اعوان فتح الباری مطبوعہ خیریہ مصر ج ۹ ص ۲۹۲ سطر ۴ و ۵ میں یہ عبارت پڑھیں:

الجواب الرابع دعویٰ الاضطراب قال القرطبی فی المفهم وقع فيه مع الاختلاف على ابن عباس الاضطراب فی لفظه (یعنی حدیث ابن عباس کا چوتھا جواب اضطراب کا دعویٰ ہے، قرطبی نے مفہم میں فرمایا کہ اس حدیث میں حضرت ابن عباس پر اختلاف کے ساتھ ساتھ ان کے لفظ میں اضطراب بھی واقع ہوا ہے)

میرا جو کام تھا میں نے کر دیا، اب مجیب صاحب علامہ قرطبی سے اضطراب کا ثبوت مانگیں اور اپنے تمام اعوان کو ملا کر اس کا جواب دیں۔ ہاں یہ یاد رکھیں کہ حافظ ابن حجر نے قرطبی کے دعویٰ اضطراب کو نقل کر کے کوئی کلام نہیں کیا ہے، باقی میں جس دن اضطراب کا دعویٰ کروں گا اس دن بغل جھانکنے کے سوا مجیب صاحب کا کوئی کام نہ ہوگا۔

(اعلام) حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اس روایت کو نقل کر کے اس کے آٹھ جواب دیے ہیں، ان میں سے چار میں نے نقل کیے ہیں بقیہ چار وہیں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔

(آثار) افسوس تو یہی ہے کہ آپ نے نقل نہیں کیا۔

جواب:- اس میں افسوس کی کیا بات ہے، اگر آپ کو اور آپ کے اعوان کو ہمت ہے تو فتح الباری میں ان جوابوں کو پڑھ کر ان کا جواب دیجئے، میں نے نقل نہیں کیا لیکن یہ تو لکھ دیا ہے کہ ''وہیں (یعنی فتح الباری میں) ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں'' پھر اب کیا مانع ہے، کیا آپ لوگوں کے پاس فتح الباری نہیں ہے یا جب تک ان جوابوں کا اردو ترجمہ نہ کیا جائے آپ لوگ ان کو سمجھ نہیں سکتے؟ جو مانع ہو صاف صاف لکھیے ورنہ ان جوابوں کا جواب دیجئے۔ آپ کے اس لیت ولعل سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ ان قاہر جوابوں کے آگے آپ بالکل عاجز ہیں۔

(اعلام) پھر بہت زیادہ قابل توجہ بات یہ ہے کہ طاؤس نے حضرت ابن عباسؓ سے یہ روایت نقل کی ہے اور خود ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس کے خلاف فتوے دیے ہیں۔ میں نے ان کے فتوے کا ذکر پہلے کیا ہے اور حضرت ابن عباسؓ سے ان کے جن جن شاگردوں نے اس کو نقل کیا ہے ان میں سے بعض کے نام بھی بتائے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو یہ روایت وہم ہے جیسا کہ ابن عبدالبر کا خیال ہے، یا پھر منسوخ ہے، ورنہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ فتویٰ نبوی کا علم رکھتے ہوئے اس کے خلاف فتویٰ دیں۔

(آثار) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان سطور کو حوالۂ قلم کرنے کے وقت مولف کی قوت اجتہادیہ پر غلبہ امتلا تھا کیا اس بے ساختہ پن پر بھی معتقدین...... یہ نہ سمجھیں گے کہ یہ آپ کے دماغ کی خاص پیداوار ہے۔

جواب:- مجیب صاحب ناحق اپنے اوپر دوسروں کو بھی قیاس کر رہے ہیں۔ میری عبارت میں تو کوئی اشارہ اس بات کا موجود نہیں ہے کہ یہ بات پہلے پہل مجھ کو سوجھی ہے۔ باقی رہا آپ کا یہ کہنا

کہ ’’فتح الباری کی عبارت کا لفظی ترجمہ کیا گیا ہے‘‘ تو اولاً یہ صریح جھوٹ ہے، اگر آپ سچے ہیں تو میری پوری عبارت کے ہم معنی کوئی عبارت فتح الباری سے نقل کیجئے، صرف ایک فقرہ کا ہم معنی فقرہ نقل کرنے سے کام نہیں چل سکتا۔

ثانیاً:- اگر یہ صحیح بھی ہو تو اس میں کیا برائی ہے۔ آخر آپ نے بھی تو جتنے جواب دیے ہیں وہ سب کے سب (الا ما شاء اللہ) ابن القیم یا مولانا ڈیانوی کی عبارتوں کے لفظی ترجمہ ہیں، اور اپنی قابلیت کی جھوٹی شہرت کی ہوس میں آپ نے عموماً حوالے نہیں دیے ہیں۔ اس کے علاوہ اور باتوں کا جواب بحث نسخ میں دیکھئے۔

(اعلام) پھر اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ ابوالصہباء (جس کی شخصیت بالکل مجہول ہے اور بالکل یقینی ہے کہ وہ صحابی نہیں ہے اس) کو تو معلوم تھا کہ عہد نبوی وعہد صدیقی میں طلاق ثلث ایک تھی، لیکن صحابہ کا جم غفیر اس حکم سے واقف نہ تھا، ورنہ کیا وجہ ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے تینوں کو نافذ کیا اور اس کا اعلان فرمایا تو کسی صحابی نے نہ ٹوکا، کسی نے مخالفت نہ کی، کسی نے نہ بتایا کہ یہ عہد نبوی وعہد صدیقی کے خلاف ہے، اور اگر کسی نے مخالفت کی ہو تو کوئی صاحب ہمت کر کے ذرا ان کا نام لیں اور ثابت تو کریں۔

(آثار) مولف معترض کا نام نہیں لیتے ...... مولف کا یہ اعتراض علامہ ماردینی صاحب الجوہر النقی کے طفیل میں ہے الخ

جواب :- ناظرین سمجھتے ہوں گے کہ مجیب صاحب میری پوری عبارت کی نسبت یہ فرما رہے ہیں، مگر واقعہ یوں نہیں ہے، بلکہ انھوں نے صرف ابوالصہباء کی شخصیت کو مجہول کہنے کی نسبت یہ فرمایا ہے، اس بحث کو بھی میں پہلے لکھ چکا ہوں اور بتا چکا ہوں کہ ابوالصہباء کو موالی ابن عباس میں غیر معروف کہنے والے ابن عبدالبر ہیں، لہٰذا ماردینی کو اصلی معترض لکھنا غلط بیانی ہے۔ اس کے بعد مجیب نے صحابہ کے مخالفت نہ کرنے کی وجہیں ذکر کی ہیں اور وجھوں کے ذکر سے پہلے یہ لکھا ہے کہ ’’صحابہ اس حکم (یعنی حضرت عمرؓ کے حکم) کے نافذ کرنے کے وقت سابق حکم سے باخبر تھے‘‘ میں مجیب صاحب کو چیلنج دیتا ہوں کہ اگر وہ سچے ہیں تو کوئی ایک روایت اس دعویٰ کی پیش کریں کہ حضرت عمرؓ کے حکم نافذ کرنے کے وقت صحابہ سابق حکم سے باخبر تھے، ورنہ اپنی اس غلط بیانی کا علی الاعلان اعتراف کریں۔

(جاری ہے)

ارشاد الثقلین

بجواب اتحاد الفریقین

محدث جلیل ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ

(ساتویں قسط)

وجہ سوم:

حضرات خلفائے ثلٰثہؓ سے جنگ نہ کرنے کی تیسری وجہ شیعہ یہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ بے یار و مددگار تھے، ''ابوالائمہ کی تعلیم'' میں اس وجہ کی سخافت یوں ظاہر کی گئی ہے:

''اولاً یہ کہ رسول خدا ﷺ کے وفات پاتے ہی سب لوگ حضرت ابوبکرؓ کے طرف دار اور حضرت علیؓ سے بیزار ہوگئے۔ یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتی اور اگر یہ بات مان لی جائے تو اس کی کیا وجہ ہوسکتی ہے سوا اس کے حضرت علیؓ کو سیاست وتدبیر اور اہلیت امامت سے بالکل بیگانہ کہا جائے۔

ثانیاً یہ کہ از روئے کتب شیعہ حضرت علیؓ کا بے یار و مددگار ہونا غلط ہے''۔

نہج البلاغۃ مطبوعہ مصر جلد اول صفحہ ۴۵ میں ہے کہ رسول اللہ کے وفات پاتے ہی حضرت عباسؓ اور ابوسفیانؓ جو تمام مکہ والوں کے سردار تھے، حضرت علیؓ سے بیعت خلافت کرنے کو آئے، مگر حضرت علیؓ نے قبول نہ کیا اور حسب ذیل جواب دیا:

أيها الناس شقوا أمواج الفتن بسفن النجاة، وعرجوا عن طريق المنافرة وضعوا عن تيجان المفاخرة أفلح من نهض بجناح، أو استسلم فأراح، ماء آجن ولقمة يغص	اے لوگو! فتنوں کی موجوں کو نجات کی کشتیوں میں بیٹھ کر طے کرو اور باہم نفرت پیدا کرنے کے راستہ سے ہٹ جاؤ اور فخر کے تاج اتار رکھو۔ کامیاب ہوا وہ شخص جو قوت بازو کے ساتھ

بها اٰکلها، و مجتنی الثمرة لغیر وقت إیناعها کالزارع بغیر أرضه

اٹھا، یا صلح کرلی اورآرام دیا، یہ پانی تلخ ہے اور یہ ایسا لقمہ ہے کہ حلق کو پکڑتا ہے اور پھل کو پختگی کے وقت سے پہلے توڑنے والا مثل اس شخص کے ہے جو غیر کی زمین میں کاشت کرے۔

حاصل اس جواب کا یہ ہوا کہ حضرت علیؓ نے ان کو فتنہ انگیز اور مفسد قرار دیا اور فرمایا کہ تم آپس میں نفرت پیدا کرنا چاہتے ہو اور اپنی خلافت سے یہ کہہ کر انکار کر دیا، کہ ابھی میری خلافت کا وقت نہیں آیا، اس وقت میری خلافت کی کوشش کرنا ایسا ہے جیسے پھل کو اس کے پکنے کے وقت سے پہلے توڑنا، اور غیر کی زمین میں کھیتی کرنا۔

نہج البلاغۃ کی اس روایت سے صاف ظاہر ہے کہ اگر حضرت علیؓ حضرت صدیقؓ سے لڑنا چاہتے تو ایک بڑی جماعت ان کے ساتھ ہوتی، علاوہ اس کے حضرت علیؓ کو خدا نے بڑے بڑے معجزے دیے تھے، عصائے موسیٰ، انگشتری سلیمانؑ وغیرہ سب ان کے پاس تھے، اسم اعظم ان کو معلوم تھا، (دیکھو اصول کافی مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ صفحہ ۱۴۰ و صفحہ ۱۴۱) پس ایسی حالت میں اگر کوئی آدمی ان کے ساتھ نہ تھا تو تن تنہا تینوں خلفاءؓ سے جنگ کر کے مغلوب کر سکتے تھے، عصائے موسیٰ کو چھوڑ دیتے اژدہا بن کر سب کو نگل جاتا، یا انگشتری سلیمانؑ پہن لیتے تمام جن حاضر ہو جاتے، یہ بھی نہ سہی اسم اعظم پڑھ کر سب کو خاک کر دیتے۔ شیعہ کہتے ہیں کہ یہ چیزیں حضرت علیؓ کے پاس تھیں تو ضرور مگر خدا کا حکم نہ تھا کہ ان چیزوں سے کام لیں (الی آخرہ) مصنف اتحاد الفریقین نے ان میں سے کسی بات کا جواب نہیں دیا، بلکہ صرف یہ کیا کہ اس وجہ سے ابن ابی الحدید کی شرح نہج البلاغۃ کے حوالہ سے ذکر کر دیا، حالانکہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ ابن ابی الحدید سنی نہیں ہے وہ زیدی شیعہ ہے۔

وجہ چہارم:

یہ شیعوں نے ذکر کی ہے کہ ''مدینہ میں جنگ کرنا بنص حدیث ناجائز ہے اس لیے حضرت علیؓ نے مدینہ میں تلوار نہیں اٹھائی''

مگر یہ وجہ بھی حد درجہ بھونڈی ہے، اس لیے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ یہ لازم آتا ہے کہ حضرت علیؓ خلفائے ثلٰثہؓ سے مدینہ میں جنگ نہ کرتے، لیکن مدینہ سے باہر نکل کر جنگ کرنے سے کیا

مانع تھا، یہ تو کچھ ضروری نہیں کہ جنگ جس سے کرنا ہو اس کے مرکزی مقام کو میدان کارزار بنایا جائے، آنحضرت ﷺ نے کفار مکہ سے متعدد بار مکہ سے باہر جنگ کی ہے، اسی طرح حضرت علیؓ نے بھی اپنے مخالفین سے مدینہ وشام سے باہر ہی جنگ کی ہے، پس اسی طرح خلفائے ثلٰثہؓ سے بھی مدینہ سے باہر نکل کر جنگ کرتے۔

اس سلسلہ میں مصنف اتحاد الفریقین نے وہ حدیث بھی نقل کی ہے جس میں مدینہ کی سختیوں پر صبر کرنے کی فضیلت بیان کی گئی ہے، لیکن افسوس ہے کہ یہ حدیث بالکل بے محل نقل کی گئی ہے، اس لیے کہ اولاً تو سختی پر صبر کرنے سے مراد یہ نہیں ہے کہ کوئی خلاف شرع امور کا ارتکاب کرے یا مرتد ہو جائے تو کچھ نہ کیا جائے، بلکہ یہ مراد ہے کہ تنگ حالی وفاقہ کشی کہ نوبت آ جائے تو مدینہ چھوڑنے کا قصد نہ کرے۔

ثانیاً:- صبر کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مستحقین جنگ سے جنگ نہ کی جائے، بلکہ یہ مطلب ہے کہ مدینہ چھوڑ کر دوسری جگہ سکونت اختیار نہ کی جائے، چنانچہ صحیح مسلم ہی میں جہاں سے مصنف اتحاد الفریقین نے یہ حدیث نقل کی ہے، یہ بیان موجود ہے کہ:

"حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس ان کی ایک لونڈی آئی، اور سلام کر کے کہنے لگی کہ زمانہ ہم پر سخت ہو گیا، اس لیے میں نے مدینہ مطہرہ سے نکل جانے کا ارادہ کر لیا ہے"۔

اس کے جواب میں حضرت ابن عمرؓ نے یہ جواب دیا کہ:

"اے بے عقل بیٹھ جا! میں نے آنحضرت ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ جو آدمی مدینہ کی سختی پر صبر کرے گا، میں اس کی شفاعت کروں گا اور قیامت کے دن اس کا گواہ رہوں گا"۔

اسی طرح مصنف اتحاد الفریقین نے یہ بات بھی یہاں بالکل بے جوڑ لکھ دی کہ:

"آنحضرت ﷺ پر بھی جناب امیرؓ سے کچھ کم تکالیف کی افتاد نہ تھی مگر صبر سے کام لیا"۔ صفحہ ۴۲

شیعہ مصنف کی حواس باختگی قابل ملاحظہ ہے، غریب کو یہ خبر ہی نہیں کہ جس زمانہ کے واقعات وہ ذکر کر رہا ہے، وہ زمانہ وہ ہے جب آنحضرت ﷺ کو جنگ کا حکم نہ ہوا تھا، چنانچہ جب اذن جنگ کی آیت نازل ہو گئی تو قرآن، حدیث اور تاریخ شاہد ہے کہ آنحضرت ﷺ نے بارہا جنگ کی، نیز

شیعہ مصنف اس سے بھی بے خبر ہے کہ مخالفین دین ومبدلین شریعت ومرتدین سے جنگ اوران کے فتنہ وفساد کوفرو کرنا صبر کے منافی نہیں، بلکہ صبر کی بہترین مثال ہے۔

وصیت صبر کے بطلان کی ایک اور وجہ اور اس کے جواب میں شیعہ مصنف کی سراسیمگی ابوالائمہ کی تعلیم میں لکھا گیا تھا کہ ''سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اگر یہ وصیت واقرار کا قصہ صحیح ہوتا تو حضرت علیؓ کوتمام عمر صبر سے کام لینا چاہئے تھا اور جمل وصفین کی لڑائیاں قطعاً ناجائز ہوں گی، اور حضرت علیؓ پران لڑائیوں کی وجہ سے سخت گناہ عائد ہوگا''۔ (صفحہ ۶۱)

اس کے جواب میں مصنف اتحاد الفریقین لکھتا ہے:

''آنحضرت ﷺ نے اپنے اصحابؓ اور حضرت علیؓ سے دوعہد لیے تھے اور وہ دوزمانوں سے تعلق رکھتے تھے پہلا عہد تو زمانہ خلفائے ثلثہؓ کے متعلق تھا، جس میں آنحضرت نے صبر وتحمل کا حکم فرمایا تھا اور دوسرا عہد قتال ناکثین وقاسطین ومارقین کے متعلق تھا کہ جس میں مددگار بھی کافی ہوگئے تھے اور خلافت ظاہری پرحضرت علیؓ فائز ہوگئے تھے'' (صفحہ ۵۱)

شیعہ صاحبان آنکھیں کھول کر دیکھیں کہ ان کا ممتاز الافاضل کیسا سفید جھوٹ بول رہا ہے، وصیت صبر جس کوشیعہ مصنف پہلا عہد کہتا ہے، اس کے آخر میں حضرت علیؓ کے الفاظ یہ ہیں:

صابراً محتسباً أبداً حتى أقدم عليك. یعنی میں ہمیشہ صبر کروں گا یہاں تک کہ آپ کے پاس پہنچ جاؤں (اصول کافی صفحہ ۱۷۳)

دیکھئے یہاں ابداً یعنی ہمیشہ کا لفظ صاف صاف موجود ہے، لہذا اب یہ کیونکر تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ یہ وصیت زمانۂ خلفاءؓ کے متعلق تھی، اگر اتنے ہی زمانہ کے متعلق تھی تو حضرت علیؓ نے ہمیشہ کے لیے صبر کرنے کا عہد کیوں کیا؟

اصل یہ ہے کہ اس وصیت کے مضمون نے شیعہ مصنف کوحواس باختہ کردیا ہے، اس پر جو اعتراضات پڑتے ہیں ان کا کوئی جواب شیعہ مصنف کے پاس نہیں ہے، اسی لیے وہ وصیت کے اصل الفاظ نقل نہیں کرتا، اور چاہتا ہے کہ اصل الفاظ کوسامنے لائے بغیر عوام شیعہ کو الٹی سیدھی باتیں سمجھا دی جائیں۔

اس کے بعد شیعہ مصنف نے پہلے دعویٰ کا تیسرا جز اس عنوان کے ماتحت ذکر کیا ہے۔

جناب امیر اور بیعت خلفائے ثلٰثہؓ:

فرقۂ شیعہ کا عقیدہ ہے کہ جناب امیرؓ نے خلفائے ثلٰثہؓ سے بیعت نہیں کی، اہل سنت وجماعت بھی اس عقیدہ میں متحد ہیں (اتحاد الفریقین ص۵۱) اور اس کے ثبوت میں سب سے پہلے بیعت کا یہ معنی ذکر کیا ہے:

> ''اپنے پیشوا کو سمجھ کر اس کی اطاعت کا عہد و پیمان کرنا اور اپنے کو اسی نقطۂ نظر سے اس کا مطیع فرمان سمجھنا نہ کہ فقط ہاتھ پر ہاتھ رکھ دینا'' (صفحہ۵۱)

اس کے بعد اپنے خیال میں یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت علیؓ خلفائے ثلٰثہؓ کو برحق پیشوا نہیں سمجھتے تھے، لہٰذا خلفاءؓ کے ہاتھ پر انھوں نے ہاتھ رکھ بھی دیا تو بھی یہ حقیقی بیعت نہیں ہوئی۔

میری گزارش:

اس کی نسبت یہ ہے کہ آپ کے یہ سارے مقدمات تھوڑی دیر کے لیے صحیح مان لیے جائیں، تب بھی یہ سوال باقی رہتا ہے کہ حضرت علیؓ نے خلفاءؓ کے ہاتھ پر ہاتھ کیوں رکھا؟ اور اپنے ضمیر[1] کے خلاف ظاہری ہی طور پر سہی، خلفاءؓ کی اطاعت پر بیعت کیوں کی؟ اگر کہیئے کہ حضرت علیؓ پر نہایت جبر وتشدد کیا گیا، اور انھوں نے تشدد سے تنگ آ کر ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا، جیسا کہ اتحاد الفریقین صفحہ۶۹ سے لے کر صفحہ۷۹ تک آپ نے اسی کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، تو عرض ہے کہ وصیت صبر کے پیش نظر حضرت علیؓ کو اس حالت میں بھی ایسا کرنا جائز نہ تھا، اس لیے کہ اس وصیت میں حضرت علیؓ نے دشمنان خدا ورسول سے بیزاری کا عہد کیا ہے، چاہے اس میں ان کی جان ہی چلی جائے، (دیکھو کافی صفحہ۱۷۳)

پس جان بچانے کے لیے خلفاءؓ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دینا، اس وصیت کی صریح مخالفت اور کھلی ہوئی عہد شکنی ہے، نیز حسب تصریح مصنف اتحاد الفریقین یہ نفاق ہے، اس لیے کہ وہ اتحاد الفریقین صفحہ۵۲ میں صاف صاف لکھتے ہیں:

---

(۱) شیعہ مصنف کی خانہ ساز بیعت جبری کا ایک جواب خود حضرت علیؓ نے دیا ہے جو سننے کے قابل ہے، فرماتے ہیں: **یزعم انه قد بایع بیده ولم یبایع بقلبه فقداقر بالبیعة وادعی الولیجة فلیات علیها بامر یعرف والا فلیدخل فیما خرج منه** (نہج البلاغۃ صفحہ۴۸ ج۱) یعنی وہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے صرف ہاتھ سے بیعت کی اور دل سے بیعت نہیں کی تو اس نے بیعت کا اقرار کرلیا، اور ایک مخفی بات کا دعویٰ کیا پس اس پر کوئی ایسی حجت لائے جو معروف ومعلوم ہو ورنہ جس بیعت سے نکلنا چاہتا ہے اسی میں داخل ہو۔ شیعہ مصنف بتائے کہ حضرت علیؓ کے ضمیر کی مخالفت پر کیسے مطلع ہوا اور اس پر کون سی حجت ہے، ۱۲ منہ۔

’’’یہی وجہ تھی کہ جن لوگوں نے آنحضرت ﷺ کو اپنا برحق پیشوا سمجھ کر محکومیت کا عہد و پیمان نہیں کیا تھا بلکہ فقط ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اطاعت کا اقرار کر لیا تھا‘‘
باوجودے کہ بکثرت دلائل و براہین معجزات سے ان پر حجت تمام ہو چکی تھی، ایسے لوگ منافقین کہے گئے اور ان کا دین و ایمان میں کوئی حصہ نہ تھا‘‘

شیعہ مصنف کی بے عقلی دیکھئے کہ حضرت علیؓ کو معاذ اللہ منافق ماننا گوارا کرتا ہے، لیکن یہ کسی طرح کہنا پسند نہیں کرتا کہ علیؓ نے بخوشی و رضامندی خلفاءؓ کی بیعت کی تھی، شیعوں کے مولائے علی کی حقیقت یہی ہے، غور کیجئے کہ منافقین عہد نبویؐ تو دلائل سے مرعوب ہو کر ظاہری بیعت پر مجبور ہوئے تھے، لیکن یہاں حسب اصول شیعہ خلفاءؓ کی حقیت خلافت کے دلائل سے حضرت علیؓ مرعوب بھی نہیں ہوئے تھے، پھر بھی انھوں نے دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتے ہوئے اپنے ضمیر کے خلاف اور پیمان رسول کو سرپائے استحقار سے ٹھکراتے ہوئے خلفاءؓ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

اب ناظرین انصاف کریں کہ حضرت علیؓ کی محبت وعظمت اس میں ہے کہ ان کی بیعت کو خلاف ضمیر مانا جائے جیسا کہ شیعہ مصنف کہہ رہے ہیں، یا اس میں ہے کہ جبر و اکراہ و تشدد کا قصہ غلط و بے بنیاد اور شیعوں کا خود تراشیدہ افسانہ قرار دیا جائے؟

میں تو سمجھتا ہوں کہ حضرت علیؓ کی عظمت وجلالت کا تھوڑا سا اعتقاد بھی جس کو ہوگا، وہ دوسری ہی صورت کو اختیار کرے گا، اور واقعۃً بھی دوسری ہی صورت متعین ہے، اس لیے جبر و اکراہ کے قصہ کا سراسر بے بنیاد ہونا براصول اہلسنت تو بالکل اظہر من الشمس ہے، اہلسنت کا ایک عالم بھی حضرت علیؓ کی بیعت کو جبری نہیں مانتا، اور اہلسنت کی کسی روایت میں اس کا اشارہ تک بھی نہیں ہے، چنانچہ اس کی بین شہادت یہ ہے کہ اتحاد الفریقین کے شیعہ مصنف نے اس بیعت کو جبری ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی تک کا زور صرف کر دیا ہے، لیکن اہلسنت کی کتابوں سے کوئی کمزور سے کمزور ثبوت بھی پیش نہیں کر سکے ہیں۔

شیعہ مصنف نے اتحاد الفریقین کے آٹھ صفحے (۶۹ تا ۷۶) بیعت جبری کو ثابت کرنے کے لیے سیاہ کر ڈالے ہیں، لیکن خود شیعہ صاحبان اتحاد الفریقین ہاتھ میں لے کر انصاف سے بتائیں کہ ان آٹھ صفحوں میں سوائے فاطمہ زہراؓ کا گھر جلانے کی دھمکی کے............اور کیا مذکور ہے؟ اور خدا لگتی

کہیں کہ جو عبارتیں شیعہ مصنف نے ان صفحوں میں نقل کی ہیں، ان میں سے کسی ایک عبارت میں بھی یہ مذکور ہے کہ اس تشدد کی وجہ سے حضرت علیؓ نے بیعت کر لی؟ ہرگز نہیں، بلکہ پہلی ہی عبارت میں جو کتاب الامامۃ والسیاسۃ سے نقل کی گئی ہے، صاف صاف مذکور ہے: **فخرجوا فبایعوا الا علیاً** اس عبارت کا ترجمہ خود شیعہ مصنف ان الفاظ میں کرتا ہے: وہ گھر سے نکل پڑے اور آ کر بیعت کر لی مگر علیؓ نے بیعت نہیں کی (اتحاد الفریقین صفحہ ۷۰)

شیعہ صاحبان اپنے ممتاز الافاضل کی عقل کا ماتم کریں کہ اس عبارت کا اپنے ہی قلم سے یہ ترجمہ بھی کرتا ہے اور اس کو بیعت جبری کے ثبوت میں بھی پیش کرتا ہے۔

بہر حال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اہلسنت کی کتابوں میں جبری بیعت کا کوئی ذکر نہیں ہے، بلکہ ان کی روایات سے یہ ثابت ہے کہ حضرت علیؓ نے بلا توقف بخوشی بیعت کی تھی، چنانچہ اتحاد الفریقین کا مصنف بھی باوجود انتہائی کوشش کے کتب اہلسنت سے اس کا کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکا ہے۔

ہاں کتاب الامامۃ والسیاسۃ سے گھر جلانے کی دھمکی کا ثبوت ضرور پیش کیا گیا ہے، لیکن میں ثابت کر چکا ہوں کہ کتاب الامامۃ والسیاسۃ کا مصنف بالکل مجہول ہے اور یقیناً وہ کوئی سنی شخص نہیں ہے، پس اس کتاب کو اہلسنت کی کتابوں میں شمار کرنا صریح خیانت وفریب کاری ہے، ہم بانگ دہل کہتے ہیں کہ اس کتاب کا مصنف کوئی تقیہ باز رافضی ہے، لہٰذا اس سے ہم پر احتجاج جائز نہیں ہے۔

باقی اس کے علاوہ اور جن کتابوں میں یہ ذکر ہے ان سب کا مدار ابن ابی شیبہ کی ایک روایت پر ہے جس کے راویوں کا پتہ نہیں ہے، چنانچہ مولانا احتشام الدین صاحب مرادآبادی ''نصیحۃ الشیعہ'' جلد دوم صفحہ ۱۵۴ میں فرماتے ہیں:

> ''اس روایت کا کتب صحاح میں کہیں پتہ نہیں، نہ کسی محدث نے اس کی تصحیح کی، راوی اس کے مجہول ہیں، کسی دوسری روایت سے اس مضمون کی تصدیق نہیں ہوتی، جس کتاب میں یہ روایت ہے اس میں ہر قسم کی روایتیں یہاں تک کہ جھوٹی روایتیں بھی موجود ہیں، قطع نظر اس کے نادر الوجود ہونے کی وجہ سے اس کتاب میں بھی تحریف کا احتمال ہے، اس لیے یہ قصہ ہم کو مسلّم نہیں اور جس طعن کا مدار ایسی غیر معتمد روایت پر ہو وہ قابل جواب نہیں''۔

مولانا شبلی الفاروق میں لکھتے ہیں کہ:

''سند کے لحاظ سے ہم اس روایت پر اعتبار ظاہر نہیں کر سکتے، کیوں کہ اس کے راویوں کا حال ہم کو معلوم نہیں ہو سکا''

پس اولاً تو یہ روایت ہی قابل اعتبار نہیں ہے، دوسرے اگر بفرض محال قابل اعتبار بھی ہوتی تو اس سے شیعہ مصنف کا مدعا ثابت نہ ہوتا، اس لیے کہ اس میں نہ لکڑیاں جمع کرنے کا ذکر ہے، نہ گھر جلانے کا، بلکہ صرف چند اشخاص کو یہ دھمکی دینے کا ذکر ہے کہ اگر یہ لوگ پھر اس گھر میں جمع ہوئے تو یہ گھر جلا دوں گا، لہٰذا شیعہ مصنف کا یہ لکھنا کہ ان کتابوں میں فاطمہؓ کے گھر جلانے اور لکڑیاں جمع کرنے کا ذکر ہے، بالکل جھوٹ ہے۔

یہ تو اہلسنت کے اصول پر ہے، اب رہے شیعہ تو ان کی روایات کی رو سے جبر وتشدد کی بنا پر حضرت علیؓ کا بیعت کر لینا اور بھی زیادہ ظاہر البطلان ہے، جس کو ابوالائمہ کی تعلیم میں یوں بیان کیا گیا ہے:

''اگر حضرت علیؓ حضرات خلفاء ثلثہؓ کو دشمن دین اور ظالم جانتے یا ان کی خلافت کو ناجائز سمجھتے جیسا کہ مذہب شیعہ کا بیان ہے تو ہرگز ممکن نہ تھا کہ حضرت علیؓ جیسا دیندار اور دلاور ان کے ہاتھ پر بیعت کرتا، حضرت علیؓ کے فرزند حضرت حسینؓ کا واقعۂ کربلا سبق لینے کے لیے کافی ہے کہ ایک فاسق کے ہاتھ پر بیعت نہ کی، اور اپنی آنکھوں کے سامنے تمام خاندان کو کٹوا دیا، اور خود بھی جان دے دی، بھلا جس بیٹے کی استقامت وحمیت کا یہ حال ہو اس کے باپ کی نسبت یہ گمان ہو سکتا ہے کہ اس نے بخوف جان یا بطمع دنیا ظالموں غاصبوں کے ہاتھ پر بیعت کر لی؟ حاشا ثم حاشا''۔ (صفحہ ۴۰)

شیعہ مصنف نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا، پھر اس کا جواب دیے بغیر وہی مرغے کی ایک ٹانگ رٹے جانا، ''یعنی حضرت علیؓ نے جبراً بیعت کر لی'' بکے جانا، شیعوں کے ممتاز الافاضل کی حیاداری ہے۔

غور تو کیجئے کہ حضرت علیؓ پر یہ کتنا سخت الزام دیا جا رہا ہے کہ وہ جن لوگوں کی خلافت کو ناحق سمجھتے تھے، بلکہ ان کو مرتد سمجھتے تھے، محض ان کی ایک معمولی دھمکی پر بیعت کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے، پھر طرہ یہ کہ اس کے ساتھ ہی شیعہ یہ بھی کہتے ہیں کہ:

''حضرت علیؓ نے قبر رسول پر فریاد کی کہ اے بھائی قوم نے مجھے کمزور سمجھ لیا، اور قریب ہے کہ مجھ کو قتل کر دیں''

حالانکہ یہ سراسر عقل کے خلاف ہے، جب ایک شخص ظالموں کے پنجہ میں ایسا بے بس ہو کہ اس کو اپنے ضمیر کے خلاف کام کرنا پڑے، تو اس میں اتنی جرأت ہرگز نہیں ہو سکتی کہ ان ظالموں کے خلاف لب کشائی کرے، پھر تمام علمائے شیعہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ اپنے زمانۂ خلافت میں بھی شیخین یعنی حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ کے خلاف لب کشائی نہ کر سکتے تھے اور نہیں کی، پھر بھلا عقل کس طرح باور کر سکتی ہے کہ وہ ان کے سامنے رو رو کر ان کو ظالم بتاتے، اس فریاد کا خلاف عقل ہونا انھیں الفاظ میں ''ابوالائمہ کی تعلیم'' میں ظاہر کر دیا گیا ہے، اس کا بھی کوئی جواب مصنف اتحاد الفریقین نے نہیں دیا ہے۔

شیعہ مصنف کے دوسرے دعوی کی حقیقت:

شیعہ مصنف نے دوسرا دعویٰ یہ کیا ہے کہ مفسدین زمانہ نے حضرت علیؓ کے خطبوں میں خیانتیں کی ہیں، ان میں سے کئی خیانتوں کی نسبت شیعہ مصنف کا ادعا ہے کہ اس نے پہلے پیش کی ہیں، مگر ارباب نظر جانتے ہیں کہ شیعہ مصنف کا یہ ادعا دروغ بے فروغ ہے۔ اس کے بعد شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

''علاوہ ان خیانتوں کے چند خیانتیں اور پیش کرتے ہیں، پہلی خیانت حضرت امیر المؤمنین کے اس نصیحت آموز خطبہ میں کی گئی ہے جو حضرت نے عثمانؓ کے متنبہ کرنے کے لیے ارشاد فرمایا ہے''۔ (اتحاد الفریقین صفحہ ۸۰)

اس کے بعد شیعہ مصنف نے ایک تمہید لکھی ہے جس میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے فرضی مظالم بیان کیے ہیں اور دعویٰ کیا ہے کہ یہ مظالم کتب اہلسنت سے ثابت ہیں، حالانکہ یہ سفید جھوٹ ہے۔

شیعہ مصنف نے ان فرضی مظالم کے لیے ابن واضح، مسعودی، کتاب الامامۃ والسیاسۃ اور تاریخ خمیس کے حوالے دیے ہیں، اور پہلے بتایا جا چکا ہے کہ مسعودی شیعہ ہے اور مصنف الامامۃ والسیاسۃ بھی کوئی تقیہ باز رافضی ہے، اسی طرح ابن واضح عباسی بھی یقیناً سنی نہیں ہے، اگر شیعہ مصنف سچا ہے تو اس کا سنی ہونا ثابت کرے۔ اب رہی تاریخ خمیس تو اس کا حوالہ دینے میں شیعہ مصنف نے

اپنے مذہب کی تمام خصوصیات ختم کر دی ہیں، تاریخ خمیس ہر جگہ دستیاب ہوسکتی ہے جس کا جی چاہے دیکھ لے کہ شیعہ مصنف نے جو مظالم لکھے ہیں ایک ایک کو مصنف تاریخ خمیس نے ذکر کر کے بے اصل اور غلط ثابت کر دیا، چنانچہ ابوذر رضی اللہ عنہ کے قصہ کی نسبت لکھا ہے:

يعلم صحت القصة یعنی اس قصہ کی صحت مجہول ہے، اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعود کے قصہ کی نسبت فرمایا ہے:

وأما ما رواه مما جرى على عبدالله ابن مسعود من عثمان وأمره غلامه بضربه الى آخرما رواه فكله بهتان واختلاق وهؤلاء الجهلة لا يتحاشون الكذب فيما يرونه موافقاً لأغراضهم إذ لا ديانة بهم تردهم لذلك.

حضرت ابن مسعود کے متعلق رافضیوں نے جو بیان کیا ہے کہ عثمان نے اپنے غلام سے ان کو پٹوایا وغیرہ وہ سب افترا وجھوٹ ہے اور یہ جاہل رافضی اپنی غرض کے مطابق جو روایت کرتے ہیں اس میں جھوٹ بولنے سے پرہیز نہیں کرتے ہیں، اس لیے کہ ان میں دینداری بالکل نہیں کہ ان کو اس سے باز رکھے۔

اسی طرح حضرت عمارؓ کے قصہ کی بابت فرمایا ہے:

أما ضرب عمار فسياق هذه القصة، لا يصح على هذا النحو الذى رواه.

یعنی عمارؓ کے مارنے کا قصہ تو اس کا بیان اس طور پر صحیح نہیں ہے۔

شیعہ اپنے ممتاز الافاضل کی اس حیاداری کو غور سے دیکھیں کہ خمیس کی ان عبارات سے آنکھ بند کر کے مظالم عثمانی کے لیے اس کا حوالہ کتنی جرأت کے ساتھ دیتا ہے، ان فرضی مظالم کا قلع قمع تحفۂ اثنا عشریہ میں بھی نہایت بسط و تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے، لیکن شیعہ ہیں کہ برابر اس کو رٹے جارہے ہیں۔

بہر حال اس تمہید کے بعد شیعہ مصنف حضرت علیؓ کا وہ خطبہ ترجمہ کے ساتھ نقل کر کے لکھتا ہے کہ حضرت امیرؓ کی یہ عبارت تمام تر مظالم عثمانی سے تعلق رکھتی ہے، مگر مفسدین نے ان واقعات کو ذکر نہ کر کے لوگوں کو دھوکہ دینا چاہا ہے اور حضرت امیرؓ کو علم و عمل میں عثمانؓ کے مساوی قرار دیا ہے، مگر ہمارے برادران اسلام کو اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ دنیا پرست لوگوں کی حق پوشی ہے ورنہ کہاں باب مدینۃ العلم جو علوم اولین وآخرین کا سرچشمہ جس کے اعلم الناس بعد الرسول ہونے پر امت کا اجماع اور

کہاں بقول عائشہؓ فشل (مختصراً) (اتحاد الفریقین صفحہ ۸۵و۸۶)

مجھے افسوس ہے کہ شیعہ مصنف نے حضرت علیؓ کا وہ خطبہ وہاں تک نقل نہیں کیا جہاں تک ''ابوالائمہ کی تعلیم''، میں نقل کیا گیا ہے، ورنہ ہر شخص اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا کہ شیعہ مصنف دوسروں کو خیانت کا الزام دینے میں حق بجانب ہے یا خود ہی اعلیٰ درجہ کا خائن وفریب کار ہے، میں وہ خطبہ جتنا ''ابوالائمہ کی تعلیم''، میں نقل کیا گیا ہے اتنا نقل کر کے شیعہ مصنف کی خیانت وفریب کاری ظاہر کرتا ہوں:

إن الناس ورائی وقد استسفرونی بینک وبینهم، ووالله ما أدری ما أقول لک، ما اعرف شيئاً تجهله ولا أدلک علی شیٔ لا تعرفه، إنک لتعلم ما نعلم، ما سبقناک إلی شیٔ فنخبرک عنه، ولا خلونا بشیٔ فنبلغه وقد رأیت کما رأینا، وسمعت کما سمعنا، وصحبت رسول الله کما صحبنا، وما ابن ابی قحافة ولا ابن الخطاب أولی بعمل الحق منک، وأنت أقرب إلی رسول الله ﷺ وشیجة رحم منهما وقد نلت من صهره مالم ینالا.

لوگ میرے پیچھے ہیں اور انھوں نے مجھ کو آپ کے اور اپنے درمیان میں سفیر بنایا ہے قسم اللہ کی کہ میں نہیں جانتا کہ آپ سے کیا کہوں مجھے کوئی بات ایسی معلوم ہی نہیں جو آپ نہ جانتے ہوں، نہ کوئی ایسی بات آپ کو بتا سکتا ہوں کہ جس سے آپ بے خبر ہوں، بیشک آپ وہ سب جانتے ہیں جو ہم جانتے ہیں ہم نے آپ سے کسی بات کی طرف سبقت نہیں کی، جس کی آپ کو خبر دیں نہ میں نے تنہائی میں کوئی شے آنحضرت ﷺ سے سیکھی ہے جس کو آپ تک پہنچاؤں یقیناً آپ نے بھی آنحضرت ﷺ کو اسی طرح دیکھا جس طرح ہم نے دیکھا ہے اور آپ نے بھی اسی طرح سنا ہے جس طرح ہم نے سنا ہے۔

اور آپ کو بھی حضرت کی صحبت اسی طرح حاصل ہے جس طرح ہم کو حاصل ہے اور حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ حق پر عمل کرنے میں آپ سے زیادہ حق دار نہیں اور آپ آنحضرت ﷺ سے نسبی قرابت میں بہ نسبت شیخین کے زیادہ قریب ہیں اور آپ نے رسول کی دامادی کا شرف پایا جو ان دونوں کو نہیں ملا۔

(جاری ہے)

اعیان الحجاج سے ماخوذ

مشاہیر کرام کے واقعات حج

از: محدث جلیل ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ

۱۰۰۱ھ سے ۱۱۰۰ھ تک

شیخ عبدالوہاب متقی آپ کے والد بزرگوار شیخ ولی اللہ دیار مندو (مانڈو) کے اکابر واعیان میں سے تھے، پھر حوادث زمانہ سے مجبور ہو کر برہان پور میں سکونت اختیار کی، یہاں بھی عزت واکرام کے ساتھ رہے، شیخ عبدالوہاب ابھی بہت کم سن تھے کہ ان کے والدین کا انتقال ہو گیا، مگر توفیق الٰہی شامل حال تھی، اسی وقت سے حق کی طلب میں فقر وتجرد کی راہ اختیار کر کے سیر وسیاحت شروع کر دی، زیادہ تر گجرات اور اطراف دکن، نیز سیلون وسرندیپ میں سیاحی کرتے تھے، اکثر تین دن سے زیادہ کہیں قیام نہیں کرتے تھے، الا یہ کہ کسی جگہ تحصیل علم یا مشائخ وصلحاء کی صحبت کا موقع ہاتھ آجاتا تو وہاں ضرورت کے مطابق طویل قیام کرتے تھے۔

ابھی بیس سال کے بھی نہ تھے، اور ڈاڑھی بھی نہیں نکلی تھی کہ خوش بختی نے ان کو مکہ معظّمہ پہنچا دیا۔ شیخ علی متقی اس وقت مکہ میں مقیم ہو چکے تھے، چونکہ شیخ ولی اللہ سے ان کی جان پہچان تھی، اس لیے شیخ عبدالوہاب کے آنے کی خبر پا کر شیخ علی متقی خود ان کے پاس آئے اور بڑی عنایت ومہربانی فرمائی، یہ خواہش بھی ظاہر کی کہ وہ ان کی صحبت ورفاقت میں رہیں۔

چونکہ شیخ عبدالوہاب کا خط بہت پاکیزہ تھا، اس لیے یہ بھی کہا کہ ہو سکے تو ہمارے لیے بھی کتابت کیا کرو، اس وقت شیخ عبدالوہاب نے مجردانہ بے نیازی کی بنا پر کہہ دیا کہ دیکھا جائے گا کہ قسمت میں کیا ہے؟ مگر حضرت شیخ علی متقی کے فضل وکمال اور ان کی استقامت کا مشاہدہ ہوا تو بہت شوق سے حضرت کی صحبت اختیار کر لی، ان کے والد نے شیخ علی متقی کی صحبت اختیار کرنے کی وصیت بھی کی تھی۔

شیخ علی متقی کی صحبت اختیار کرنے کے بعد شیخ کے اشارہ سے انھوں نے خط نسخ کی مشق بہم

پہنچائی اور شیخ کے لیے اتنی کتابیں نقل کیں اور اس قدر محنت سے کہ اس کا تصور دشوار ہے۔

غرضیکہ شیخ کی پیروی وخدمت اور ان کو خوش رکھنے کی اتنی زیادہ کوشش کرتے تھے، کہ ان کو فنا فی الشیخ کہنا درست تھا، اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ شیخ نے بھی ان پر بہت خاص طور پر توجہ فرمائی اور اپنے ظاہری وباطنی عنایات کے ساتھ مخصوص فرمایا، تا آنکہ وہ شیخ کے کمالات کا مثنیٰ، بلکہ ہُو بہُو شیخ متقی ہوگئے۔

شیخ عبدالوہاب جمادی الاولی ۹۶۳ھ میں حاضر خدمت ہوئے اور بارہ سال تک صحبت میں رہے، زندگی بھر وہ ان سے جدا نہیں ہوئے۔

شیخ عبدالحق کا بیان ہے کہ ۱۰۰۳ھ تک شیخ عبدالوہاب نے چوالیس حج کیے تھے، پورے زمانۂ قیام مکہ میں کبھی ان کا حج فوت نہیں ہوا، اپنے پیر کی وفات کے بعد صرف ایک دفعہ قرابتداری کا حق ادا کرنے کے لیے گجرات آئے تھے، مگر فوراً مکہ لوٹ گئے تاکہ حج فوت نہ ہو۔

ان کی کرامت ہی تھی کہ مکہ سے ہندوستان آنے میں کشتی ۱۵ دن میں آئی، اور جانے میں چالیس روز لگے، شیخ عبدالحق فرماتے ہیں، یہ دونوں باتیں بہت نادرالوقوع ہیں۔

شیخ عبدالحق دہلوی غالبًا دو سال ان کی خدمت میں رہے ہیں، اور علم ظاہر کی تحصیل کے ساتھ ساتھ باطنی تربیت کی سعادت بھی حاصل کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اہل حرمین اور تمام مشائخ یمن، اور مصر وشام کے مشائخ میں سے جن حضرات نے ان کو دیکھا تھا، سب ان کی ولایت اور بزرگی کے معتقد تھے، فرماتے ہیں کہ میں ''حزب البحر'' نقل کر رہا تھا کہ مکہ کے ایک عالم شیخ علاء الدین نامی آگئے، پوچھا کیا لکھ رہے ہو؟ میں نے کہا حزب البحر نقل کر رہا ہوں، کشتی میں سوار ہونے کے وقت اس کو پڑھوں گا، پوچھا ''حزب البحر'' کی اجازت حاصل ہے؟ میں نے کہا شیخ عبدالوہاب متقی سے اجازت لوں گا، پوچھا شیخ سے شناسائی ہے؟ عرض کیا میں دو سال سے ان کی خدمت میں ہوں، فرمایا مبارک باد! تمھارا حج مبرور اور تمھارا عمل مقبول ہے، میں نے پوچھا، آپ نے یہ کیسے فرمایا؟ کہا میں نے یمن کا سفر کیا ہے اور وہاں کے تمام مشائخ وفقراء کو شیخ کی مدح وثناء کرنے میں متفق پایا ہے، نیز سب کو یہ کہتے سنا ہے کہ وہ مکہ کے قطب ہیں۔

شیخ عبدالوہاب نے چالیس سال کی عمر تک شادی نہیں کی تھی، جب چالیس پچاس سال کے

درمیان عمر ہوئی تو شادی کی، شادی سے پہلے جو فتوح حاصل ہوتا تھا، یا کتابت سے جو ملتا تھا، سب درویشوں اور فقراء پر صرف کر دیتے تھے، کچھ بھی بچا کر نہیں رکھتے تھے، لیکن شادی کے بعد اہل وعیال کے حق کو مقدم رکھتے تھے، بایں ہمہ مسافروں کی خبر گیری اور فقراء کی غم خواری میں کوتاہی روا نہیں رکھتے تھے۔

مکہ معظّمہ میں ان کی ذات ہندوستانی حجاج کی پشت پناہ تھی، کھانے کپڑے اور نقد ہر چیز سے مدد کرتے تھے۔

شیخ عبدالحق فرماتے ہیں کہ اس زمانہ میں علوم شرعیہ کا ایسا عالم شاذ ونادر ہی کوئی ہوگا، قاموس تو گویا پوری از بر تھی، فقہ وحدیث کا بھی یہی حال تھا۔

شیخ عبدالحق فرماتے ہیں کہ ایک بار جعرانہ سے احرام باندھ کر عمرہ کرنے کا تذکرہ ہوا، تو فرمایا کہ اگر وہاں جانے کی توفیق ہو تو پہاڑ میں جہاں آنحضرت ﷺ نے قیام ونزول فرمایا تھا اس جگہ سے غافل ومحروم نہ رہنا، پھر اس جگہ کی نشاندہی وتعیین فرما کر کہتے تھے کہ قسمت یاور ہو تو اس مقام میں آنحضرت ﷺ کی زیارت میسر ہے۔

ایک دفعہ ہم اس جگہ سو گئے تھے جب جب آنکھ جھپکتی تھی، حضور ﷺ کا جمال جہاں آرا نظر میں ہوتا تھا، ایک دو پہر سے کم مدت میں سو بار سے زیادہ یہ سعادت حاصل ہوئی۔ شیخ عبدالوہاب اس عمرہ کے لیے بہت جاتے تھے، اور روزہ رکھے ہوئے ننگے پاؤں جاتے تھے، ۱۰۰۳ھ تک بقید حیات تھے، (جیسا کہ شیخ عبدالحق نے زاد المتقین میں لکھا ہے) نزہۃ الخواطر میں آپ کا سن وفات ۱۰۰۱ھ لکھا ہے، مگر یہ صحیح نہیں ہے۔

شیخ ابراہیم محدث اکبرآبادی آپ کی ولادت ونشو ونما مانکپور میں ہوئی، وہیں علم کی تحصیل بھی کی، اس کے بعد بغداد کا سفر کیا، وہاں ڈھائی سال تک حدیث وتفسیر پڑھتے رہے، پھر حج وزیارت کی سعادت حاصل کر کے مصر چلے گئے، اور وہاں شیخ شمس الدین علقمی سے حدیث کا علم حاصل کیا، اور محمد بن ابی الحسن بکری نے ان کو اجازت عطا فرمائی، پھر مکہ معظّمہ جا کر عبدالرحمٰن بن فہد اور شیخ مسعود مغربی، نیز شیخ علی متقی کی صحبت میں رہے، ان سب حضرات نے ان کو اجازت عطا فرمائی، اس کے بعد دوبارہ مصر کا رخ کیا، اور وہاں چوبیس سال تک درس دیتے رہے، ہر سال موسم حج میں مکہ آتے اور حج کی

سعادت حاصل کر کے مصر لوٹ جاتے۔

آخر آخر میں وطن کی محبت غالب آئی اور ہندوستان آکر اکبرآباد میں سکونت پذیر ہوئے۔ بدایونی نے لکھا ہے کہ بڑے پرہیزگار وعبادت گذار تھے، ساری عمر علوم دین بالخصوص حدیث کا درس دینے میں صرف کی۔

امر معروف ونہی منکر بھی کرتے تھے، ایک بار اکبر بادشاہ نے ان کو عبادت خانہ میں بلایا، تو وہ آداب بجانہیں لائے، جو شاہی دربار میں مقرر تھے، پھر ایک خطبہ دیا جس میں خوب ترغیب وترہیب فرمائی۔ آپ فقہ وحدیث، عربیت میں بڑے فائق عالم تھے، آپ کی وفات ۱۰۰۱ھ میں ہوئی۔

شیخ صبغۃ اللہ بروجی آپ بھڑوچ میں پیدا ہوئے، شیخ وجیہ الدین گجراتی سے علم حاصل کیا، اور انھیں کے ہاتھ پر بیعت کر کے سلوک کی منزلیں طے کیں، شیخ نے ان کو اجازت وخلافت عطا فرمائی، ان کے علم وفضل، زہد وتقویٰ اور بے نیازی واستغنا کی بنا پر ان کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، امراء کے طبقہ میں بھی ان کی بڑی عظمت تھی۔

پہلے ایک دفعہ سفر حجاز کیا اور حج کر کے بھڑوچ واپس ہوگئے، ۹۹۹ھ میں مالوہ منتقل ہوگئے اور ایک مدت تک مقیم رہے، پھر دوبارہ زیارت نبوی کے شوق نے بے چین کیا تو احمد نگر آکر برہان شاہ حاکم احمد نگر کے پاس ایک سال رہے، اس کے بعد حرمین کی نیت کر کے وہاں سے نکلے تو پانچ سال بیجا پور میں رہے، حاکم بیجاپور ابراہیم عادل شاہ نے اسباب سفر مہیا کیے، اور سارے مصارف کا انتظام کیا، حتی کہ اپنی ایک خاص کشتی بھی عنایت کی، شیخ اور ان کے سارے شاگرد ومرید اس میں سوار ہوکر جدہ پھر مکہ پہنچے، اور ۱۰۰۵ھ میں حج کر کے مدینہ منورہ آئے اور جبل احد میں قیام کر کے طلبہ کو درس دینا اور مریدین کی تربیت فرمانا شروع کیا۔

بہت بڑی تعداد میں لوگوں نے ان سے نفع پایا، سید امجد مرزا، شیخ اسعد بلخی، شیخ احمد بن علی شناوی، شیخ محمد بن عمر حضرمی، شیخ ابراہیم ہندی، ملا شیخ بن الیاس کردی، اور شیخ عبدالعظیم حنفی مکی ان کے جلیل القدر تلامذہ ومریدین میں ہیں۔

محبی نے خلاصۃ الاثر میں اور غزی نے لطف السمر میں لکھا ہے، کہ شیخ صبغۃ اللہ نماز پنجگانہ جماعت کے ساتھ بالالتزام حجرہ نبوی کے مشرقی جھروکے کے پاس پڑھتے تھے، غزی کہتے ہیں کہ میں

نے ان کی زیارت وہیں کی اور دعا کی درخواست کی تو فرمایا کہ نہیں آپ دعا کیجئے، آپ حاجی ہیں، میں آمین کہتا ہوں، میں ان کا حکم بجالایا، میں نے دعا کی اور وہ آمین کہتے رہے، غزؔی کہتے ہیں کہ ان کی رنگت سفید، اور چہرہ روشن تھا، ان کے چہرے سے عبادت کا نور اور علم کا دبدبہ ظاہر ہوتا تھا۔

شیخ نہایت فیاض اور سخی تھے، دور دور سے ان کے پاس پورے سال ایک لاکھ قرمش کی مقدار میں ہدایا آتے تھے، وہ سارے کا سارا فقراء پر صرف کردیتے تھے، اپنے پاس کچھ باقی نہیں رکھتے تھے۔

شیخ کی وفات ۱۰۱۵ھ میں ہوئی، مزار بقیع الغرقد میں ہے۔

شیخ (بابا) فتح محمد برہانپوری | شیخ عیسیٰ بن قاسم برہانپوری کے خلف ارشد تھے، بڑے متبحر عالم اور فقہ وحدیث میں ممتاز تھے۔

تصوف میں بھی ان کا پایہ بہت اونچا تھا، فقہ میں ان کی کتاب مفتاح الصلوٰۃ بہت مشہور ومقبول اور نہایت عمدہ ہے، اس کے علاوہ ان کی کتابوں سے ''فتوح العقائد'' اور ''فتوح الاوراد'' اور ''فتح المذاہب الاربعۃ'' کو میں نے جستہ جستہ پڑھا ہے۔

وہ علم ظاہر وباطن دونوں میں اپنے والد بزرگوار کے فیض یافتہ ہیں، مدتوں برہانپور میں ان کی بدولت درس وافادہ کی مجلس گرم رہی، بعد میں حجاز چلے گئے اور حج وزیارت کے بعد وہیں مقیم ہوگئے۔ ان کی وفات مکہ مبارکہ میں ہوئی۔

شیخ محمد بن فضل اللہ جونپوری ثم برہانپوری | ولادت ونشو ونما برہان پور میں ہوئی، شیخ صفی الدین گجراتی کے ہاتھ سے خرقہ پہنا، پھر حجاز کا سفر کیا، اور وہاں بارہ برس رہے، شیخ علی متقی کی صحبت میں رہ کر بڑا فیض حاصل کیا، اس کے بعد احمد آباد آکر نکاح کیا، اور شیخ وجیہ الدین گجراتی کی خدمت میں بارہ سال رہ کر علم حاصل کیا، سلوک کی منزلیں شیخ محمد پیر پوری اور شیخ ابومحمد بن خضر تمیمی کی خدمت میں طے کیں، اس کے بعد برہانپور میں مستقل قیام کرکے درس وافادہ میں مشغول ومنہمک ہوگئے۔

محبی نے لکھا ہے کہ وہ امام عالم، زاہد وعابد اور متقی تھے، ہند میں ان کو بڑی شہرت حاصل ہوئی، اس باب میں ان کا ہمسر کم کوئی ہوگا، ان کا روزانہ کا معمول تھا کہ دن کے آخری حصہ میں اپنے نفس کا محاسبہ کرتے تھے، اللہ کا خوف ان پر بہت غالب تھا، وہ سادات صوفیہ میں سے تھے، وحدۃ

الوجود کے زبردست حامی تھے۔

اس مسئلہ میں ان کا رسالہ ''التحفۃ المرسلۃ الی النبی ﷺ'' مشہور ہے، شاہ ولی اللہ کے استاذ شیخ طاہر کے والد ابراہیم کورانی نے اس رسالہ کی شرح لکھی ہے۔

ان کی وفات ۱۰۲۹ھ میں ہوئی، مزار برہانپور میں ہے، احقر نے اس کی زیارت کی ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ محرم ۹۵۸ھ میں پیدا ہوئے، قرآن پاک سے لے کر مصباح وکافیہ تک خود ان کے والد شیخ سیف الدین نے تعلیم دی، پھر کسی دوسرے استاذ کے پاس بارہ یا تیرہ سال کی عمر میں شرح شمسیہ اور شرح عقائد پڑھی، اور پندرہ سولہ سال کی عمر میں مختصر ومطول کا درس لیا، اور تقریباً اٹھارہ سال کی عمر میں بقدر کفایت تمام علوم نقلی وعقلی سے فارغ ہوگئے، اس کے بعد کلام پاک حفظ کیا، (خلیق احمد نظامی کا یہ بیان صحیح نہیں ہے کہ شیخ نے ابتدائی زمانہ میں کلام پاک یاد کرلیا تھا) بیس برس کی عمر میں درس وتدریس کا مشغلہ اختیار کیا، ۳۷ سال کی عمر میں بادیہ پیمائی حجاز کا شوق دامن گیر ہوا، اسی ارادہ سے ۹۹۵ھ میں کے شروع میں مالوہ ہوتے ہوئے گجرات پہنچے، تو معلوم ہوا کہ جہاز کا موسم گزر چکا ہے، اس لیے کچھ دن مرزا عزیز کوکہ حاکم مالوہ کے پاس قیام کیا، پھر مانڈو تشریف لے گئے، موقع سے فائدہ اٹھا کر محمد غوثی مصنف گلزار ابرار نے شیخ سے استفادہ کیا، پھر مانڈو سے احمد آباد تشریف لے گئے۔

ان دنوں طبقات اکبری کے مصنف مرزا نظام الدین احمد صوبہ کے بخشی تھے، انھوں نے نہایت گرم جوشی سے شیخ کا استقبال کیا، اور اصرار کرکے آئندہ موسم حج تک اپنے پاس روکے رکھا، جب موسم قریب آگیا تو، مرزا نظام الدین کے حُسن کوشش اور امداد واعانت سے شیخ نے جہاز میں سوار ہوکر حجاز کا سفر کیا۔

بدایونی نے لکھا ہے، کہ شیخ دہلی سے ایک جذب کی حالت میں بے ساز وسامان گجرات پہنچ گئے تھے۔

شیخ موسم حج سے بہت پہلے مکہ معظّمہ پہنچ گئے، چونکہ علم حدیث کا شوق بہت تھا، اس لیے جاتے ہی مکہ کے بعض محدثین کی خدمت میں حاضری شروع کردی، اس کے بعد شیخ عبدالوہاب متقی کے علمی وعملی کمالات کا مشاہدہ کرنے کے بعد ان کے دامن سے لپٹ گئے۔

رمضان آیا تو انھیں کے زیرنگرانی حرم شریف میں سنت اعتکاف بجالائے، بعد رمضان

انھیں کے پاس مشکوٰۃ کی تصحیح اوراس کے مقابلہ میں مشغول رہے، جب حج کا موسم آیا تو شیخ عبدالوہاب ہی کی معیت میں تمام مناسک حج ادا کیے، عرفات، مزدلفہ ہر جگہ شرف معیت حاصل رہا، حج سے فراغت کے بعد جب مدینہ کا ارادہ کیا تو شیخ عبدالوہاب نے فرمایا کہ ہوا نہایت سرد ہے، اور تم کمزور بدن کے آدمی ہو، اگر اسی وقت چلے گئے اور کوئی بات ہوگئی تو واپسی کو جلد جی چاہنے لگے گا، اس لیے چندروز تحمل کرو۔

شیخ عبدالحق مدینہ منورہ کی حاضری کے لیے بہت بے تاب تھے، مگر شیخ کے مشورہ کی خلاف ورزی کیسے کرتے، مجبوراً محرم وصفر دو ماہ صبر کیا، جب ربیع الاول آیا تو بے تابی شوق بڑھی اور شیخ سے پھر اجازت چاہی، شیخ نے فرمایا کہ اگر زائد صبر کی طاقت نہیں ہے تو مبارک ہو، اجازت پا کر ۲۳؍ربیع الاول کو شیخ مکہ معظّمہ سے روانہ ہوئے، اور ۵؍ربیع الآخر یا ۶ کو مدینہ منورہ پہنچے اور سید کائنات ﷺ کے حضور میں حاضری کی سعادت سے مشرف ہوئے، جمعہ کی رات آئی تو آں حضرت ﷺ کی خدمت میں اپنا قصیدہ پیش کیا، جب اس شعر پر پہنچے ؎

خرابم در غم ہجر جمالت یا رسول اللہ جمال خود نما رحمے بجان زار شیدا کن

تو اس کی تکرار کرتے کرتے زارزار رونے لگے۔ شیخ کہتے ہیں، غالب گمان ہے کہ حضرت نے اس کو پسند فرمایا، کیونکہ رجب ۹۹۸ھ کی ۱۷یا۱۸ تاریخ کو رات میں جبل احد کے قریب ایک مسجد میں آنحضرت ﷺ کو میں نے خواب میں دیکھا اور حضرت سے بغل گیر ہوا اور آنحضرت ﷺ نے تبسم فرمایا۔

حضرت شیخ کم وبیش تین سال مکہ معظّمہ میں رہے، حرمین کے محدثین سے حدیث کی سند لی، علماء کی صحبت سے مستفید ہوئے، خصوصیت کے ساتھ شیخ عبدالوہاب کی صحبت اختیار کی، سب سے زیادہ انھیں سے فائدہ اٹھایا، شیخ نے ان پر خاص توجہ کی۔

شیخ فرمایا کرتے تھے کہ ان دنوں ہندوستان سے اس پایہ کا کوئی دوسرا شخص ان مقامات مقدسہ میں نہیں آیا، ہاں شیخ علی متقی کے زمانہ میں ایک دو آدمی آئے تھے، شیخ اپنے خدام سے یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ شیخ عبدالحق کی خاطر کو عزیز رکھو، اور ان کے وجود کو غنیمت سمجھو، وہ مہمان عزیز ہیں، شیخ عبدالوہاب نے حدیث وتصوف کی تعلیم کے ساتھ شیخ عبدالحق کی باطنی تربیت بھی فرمائی تھی۔

حجاز سے واپسی سے پہلے ان کو شیخ عبدالوہاب نے کتب تفسیر واحادیث اور کتب تصوف وعربیت اور مصنفات سیوطی وشیخ علی متقی کا اجازت نامہ لکھوا کر عنایت فرمایا، ان کے علاوہ دوسرے علمائے حرمین نے بھی شیخ عبدالحق کو حدیث وقرأت کی سند عطا فرمائی۔

شیخ عبدالحق کی علمی خدمات محتاج بیان نہیں ہیں، مشکوٰۃ کی شرح ''اشعۃ اللمعات'' شرح سفر السعادۃ، مدارج النبوۃ، ماثبت بالسنۃ، اوران کی دوسری کتابوں سے ایک عالم فیض اٹھا چکا ہے، اور آج بھی وہ فیض جاری ہے، شیخ کے سوانح حیات میں دو مستقل کتابیں اردو میں شائع ہو چکی ہیں۔

شیخ کی وفات ۱۰۵۲ھ میں ہوئی، دہلی میں حوض شمسی کے کنارہ آپ مدفون ہیں، اس حقیر نے مزار کی زیارت کی ہے۔

شیخ آدم بنوری آپ نے پہلے الحاج خضر روغانی سے طریق کی تعلیم پائی، پھر ان کے حکم سے سرہند آئے اور حضرت مجدد الف ثانی کی صحبت میں مدتوں رہے، ان کے طریقہ کا امتیازی وصف یہ تھا کہ اتباع شریعت اور پیروی سنت کا غایت درجہ اہتمام فرماتے تھے۔

ان کے مریدین کی تعداد بہت زیادہ تھی، کہا جاتا ہے کہ چار لاکھ انسانوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی، اوران میں سے ایک ہزار آدمیوں نے علم ومعرفت کا وافر حصہ پایا، ان کی خانقاہ میں تقریباً ایک ہزار طالبوں کو روزانہ ان کے مطبخ سے کھانا دیا جاتا تھا۔

۱۰۵۲ھ میں جب وہ لاہور روانہ ہوئے تو دس ہزار سادات ومشائخ اور مختلف طبقات کے لوگوں کی ایک فوج ان کی معیت میں تھی، اس زمانہ میں شاہ جہاں لاہور میں تھا، اس کو معلوم ہوا تو اس نے اپنے وزیر سعد اللہ خاں کو حکم دیا کہ شیخ کی خدمت میں حاضر ہو کر حقیقت حال معلوم کرے، سعد اللہ خاں آیا، مگر صحبت مکدر رہی، اس لیے اس نے بادشاہ کے کانوں تک حقیقت کے خلاف نامناسب باتیں پہنچائیں، بادشاہ نے حکم دیا کہ شیخ اپنے کنبے قبیلے اور مریدین کے ساتھ حجاز چلے جائیں، شیخ روانہ ہو گئے اور حج کر کے مدینہ منورہ میں تازندگی مقیم رہے۔

آپ کی وفات ۱۰۵۳ھ میں ہوئی، سیدنا حضرت عثمانؓ کے مزار کے قریب آپ مدفون ہیں۔

شیخ ابوتراب گجراتی چانپانیر میں پیدا ہوئے، اور احمد آباد میں سکونت اختیار کی، جب اکبر نے گجرات فتح کیا، تو ۹۸۹ھ میں ان کو امیر الحاج بنا کر حرمین میں تقسیم کرنے کے لیے پانچ لاکھ چاندی کا سکہ اور دس ہزار خلعت فاخرہ ان کو دے کر مکہ روانہ کیا، وہ حج و زیارت سے مشرف ہو کر ۹۹۱ھ میں ہندوستان آئے۔

شیخ ابوتراب کی وفات ۱۰۰۳ھ میں ہوئی۔

گیارہویں صدی کے اکابر میں سے جو حضرات ہندوستان سے حج کے لیے گئے ہیں، ان میں مندرجہ ذیل حضرات نہایت ممتاز ہیں۔

۱:- حضرت شاہ علم اللہ بریلوی المتوفی ۱۰۹۶ھ

۲:- سید غضنفر نہروالی جن کے شاگردوں میں احمد بن علی شناوی، عبدالرحمٰن بن عیسیٰ مرشدی اور امام عبدالقادر طبری تھے۔

(جاری ہے)

☆☆☆☆☆

صفحہ ۸۷ کا بقیہ آپ ہی حضرات سے سنا اور پڑھا ہے کہ ایسے صدموں کا صلہ اللہ تعالیٰ نے سب جنت میں رکھا ہے۔ اور مرحومہ کے حق میں خیر کا یہ پہلو کہ اگر وقت بعد میں آتا تو ماں باپ کے دکھے دل کی مغفرت کی دعائیں کہاں سے ملتیں، اور کسی جانے والے کے لیے ان سے زیادہ قیمتی اور عزیز کوئی بھی سرمایہ نہیں۔ **اللّٰهم اغفر لها، وارحمها، وعافها، واعف عنها، وأكرم نزلها، ووسع مدخلها، اللّٰهم تقبل حسناتها، وتجاوز عن سيئاتها، اللّٰهم لا تحرمنا أجرها، ولا تفتنا بعدها، اللّٰهم كن لها خيراً منا، وكن لنا خيراً منها، اللّٰهم أفرغ علينا صبراً وتوفّنا مسلمين.**

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

امام اعظم ابوحنیفہؒ
محدثین ومعاصرین کی نظر میں
اوران کے فقہی اجتہاد پر عمل کرنے والے ان کے معاصر محدثین
(دوسری وآخری قسط)

از: مسعود احمد الاعظمی

امام صاحب کے اقوال پر عمل کرنے والے ان کے دور کے محدثین:

۱-امام اعمش - : امام ابوحنیفہؒ کی نسبت ان کی رائے پیچھے گزر چکی ہے۔ حدیث وروایت حدیث میں ان کا وہ مقام تھا کہ ان کے بارے میں حضرت محدث الاعظمیؒ نے لکھا ہے: ''آپ کا لقب علامۃ الاسلام ہے، حدیث وروایت کے بے مثل امام تھے''۔ اس کے باوجود امام ابوحنیفہ کے تفقہ پر ان کو اس قدر اعتماد تھا کہ اس کی نسبت حضرت محدث الاعظمیؒ نے لکھا ہے:

> ''اس علمی وعملی عظمت کے باوجود جب حج کے ارادہ سے نکلے اور مقام حیرہ میں پہنچے، تو اپنے شاگرد علی بن مسہر سے کہا کہ جاؤ امام ابوحنیفہ سے ہمارے لیے مناسک حج لکھوالاؤ اور فرماتے تھے کہ تم لوگ ابوحنیفہ سے دریافت کرکے مناسک حج لکھ لو، اس لیے کہ حج کے فرائض ونوافل کا ان سے زیادہ واقف کار کوئی نہیں ہے''[۱]۔

۲-مِسعر بن کِدام- : ان کے بارے میں گزر چکا ہے کہ فرمایا کرتے تھے: **رحم اللّٰہ أبا حنیفة إنه کان لفقیهاً عالماً.** امام صاحب کے بالکل معاصر تھے، علامہ شمس الدین شافعی دمشقی نے عقود الجمان (ص۱۹۶) میں جعفر بن عون کی روایت سے نقل کیا ہے کہ مسعر سے سوال کیا گیا کہ: **لم ترکت أصحابک وأخذت برأي أبي حنیفة؟** (آپ نے اپنے ہم مشرب لوگوں کی

(۱) اعیان الحجاج: ۱/۱۱۵

رائے کو چھوڑ کر ابوحنیفہ کی رائے کیوں پکڑ لی؟) انھوں نے جواب میں فرمایا:

أنا فعلت ذلک لصحة رأيه، فأتوا بأصح منه لأرغب عنه إليه.

میں نے ایسا ابوحنیفہ کی رائے کی درستگی کی وجہ سے کیا ہے، اگر اس سے زیادہ صحیح کسی کی رائے ہوسکتی ہو تو بتلاؤ میں ابوحنیفہ کو چھوڑ کر اس کو اختیار کرلوں گا۔

۳- سفیان ثوری- : یہ بھی امام صاحب کے ہم عصر تھے اور ان کے ہم چشم سمجھے جاتے تھے، وہ بھی امام صاحب کے خرمن علم سے خوشہ چینی کیا کرتے تھے، قاضی ابوعبداللہ صیمری نے **أخبار أبي حنيفة و صاحبيه** (ص ٦٦) میں لکھا ہے:

ولقد احتال الثوری في كتاب الرهن حتى نسخه (یعنی حضرت سفیان ثوری نے امام صاحب کی کتاب الرہن حاصل کر کے اس کو نقل کیا تھا)

اور علامہ شمس الدین شافعی نے اسی کتاب کی نسبت عقود الجمان (ص ۱۹۰) میں لکھا ہے کہ یہ کتاب حضرت سفیان کے سرہانے رہا کرتی تھی۔

محدث جلیل حضرت علامہ اعظمی نے اپنے مقالات میں لکھا ہے:

''آپ کے پاس فقہ ابی حنیفہ کے کچھ اجزا پائے گئے، جن کا آپ بشوق تمام مطالعہ کرتے تھے، اور آپ کو یہ تمنا کرتے سنا گیا کہ کاش اس کے اور اجزا بھی دستیاب ہوتے''[1]۔

آپ امام ابوحنیفہ کی کیسی پیروی کرتے تھے، اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ علامہ ابن عبدالبر نے انتقاء (۱۹۸) میں، اور علامہ شمس الدین دمشقی نے عقود الجمان (۱۹۱) میں امام ابویوسف کا یہ قول نقل کیا ہے:

سفيان الثوري أكثر متابعة لأبي حنيفة مني. سفیان ثوری ابوحنیفہ کی مجھ سے زیادہ پیروی (تقلید) کرتے ہیں۔

۴- لیث بن سعد مصری- متوفی ۱۷۵ھ- : حدیث وفقہ کے اتنے زبردست امام تھے کہ بعض حضرات نے ان کو امام مالک پر فضیلت دی ہے، حدیث کی شاید ہی کوئی کتاب ان کی روایات سے خالی

---

(۱) مقالات ابوالمآثر: ۲۹/۱

ہوگی، اور تفقہ میں بھی نہایت بلند شان رکھتے تھے، اس کے باوجود امام ابوحنیفہ کے تفقہ کے اس قدر معترف تھے کہ علامہ زاہد کوثری نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ بہت سے اہل علم نے ان کو حنفیہ میں شمار کیا ہے، اور لکھا ہے کہ قاضی زکریا انصاری نے ان کے حنفی ہونے کو شرح بخاری میں جزم کے ساتھ لکھا ہے۔

علامہ کوثری نے یہ بات **فقه أهل العراق وحديثهم** میں صفحہ ۶۰ پر لکھی ہے، اور اس کے حاشیہ میں ان کے شاگرد اور محدث ومحقق شیخ عبدالفتاح ابوغدہ نے اس کے لیے ابن خلکان کی وفیات الاعیان کا بھی حوالہ دیا ہے، ابن خلکان کے الفاظ یہ ہیں:

ورأيت في بعض المجاميع أن الليث كان حنفي المذهب.

۵- قاسم بن معن بن عبدالرحمٰن -متوفی ۱۷۵ھ- : حدیث وفقہ کے ساتھ ساتھ عربیت کے بھی امام تھے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پڑپوتے تھے، اور امام ابوحنیفہ کے اجلۂ تلامذہ میں تھے، علامہ مزی نے تہذیب الکمال (۳۴۱/۷) میں اور حافظ ذہبی نے **سيــــر أعـــلام النبلاء** (۳۹۸/۶) میں ان کا یہ قول نقل کیا ہے:

ما جلس الناس إلى أحد أنفع من مجالسة أبي حنيفة.

یعنی لوگوں نے ابوحنیفہ کی ہم نشینی سے زیادہ نفع بخش کسی کی ہم نشینی نہیں اختیار کی۔

۶-عبداللہ بن مبارک- : حضرت ابن مبارک کی جس طرح حدیث وروایت میں امامت مسلَّم ہے، اسی طرح ان کا امام ابوحنیفہ کا تابع ومقلد ہونا بھی ایک نا قابل انکار حقیقت ہے، یہاں امام ابوحنیفہ کی شان میں ان کے چند اشعار نقل کر دینا چاہتا ہوں، جن کو علامہ مزی نے تہذیب الکمال (۳۴۴/۷) میں ذکر کیا ہے:

رأيــت أبــا حـنـيـفة كـل يـوم — يــزيــد نبـــالة ويـزيـد خيـراً

ويـنـطـق بالصواب ويصطفيه — إذا مـاقـال أهـل الـجور جورا

يـقـــايـــس مـن يـقـايسـه بلُبٍّ — فـمـن ذا تـجـعـلون لـه نظيرا

كـفـانـا فـقـد حـمـادٍ وكانت — مــصيبتــنــا بــه أمـراً كبيـراً

فــردّ شـــمـاتة الأعـداء عـنـا — وأبـدى بـعـده عـلـمـاً كثيـراً

رأيت أبا حنيفة حين يوتی　　ويُطلب علمه بحراً غزيراً
إذا ما المشكلات تدافعتها　　رجال العلم كان بها بصيراً

میں نے ابوحنیفہ کو دیکھا روزانہ شرافت اور خیر میں بڑھتے ہوئے۔
وہ صحیح بات چنتے اور بولتے ہیں، جبکہ ظلم والے ظلم کرتے ہیں۔
وہ قیاس کرتے ہیں تو عقل سے کام لے کر قیاس کرتے ہیں، لہذا تم لوگ کس کو ان کے مثل قرار دے سکتے ہو۔
انھوں نے حماد (ابن ابی سلیمان) کی کمی کو پورا کر دیا، حالانکہ حماد کی وفات ہمارے لیے بڑی مصیبت کی بات تھی۔
سوانھوں نے دشمنوں کی خوشی پر پانی پھیر دیا، اوران (حماد) کے بعد خوب خوب علم کو ظاہر کیا۔
میں نے دیکھا ہے کہ جب ابوحنیفہ کے پاس کوئی آتا ہے اور ان سے علم حاصل کرنا چاہتا ہے، تو وہ علم کا ایک بحر زخار ہوتے ہیں۔
جب علمی مشکلات پیش آتی ہیں اور اہل علم ان کو ایک دوسرے کے حوالے کرتے ہیں، اس وقت ان کی بصیرت اور دیدہ وری دکھائی دیتی ہے۔

۷- یحییٰ بن زکریا بن أبی زائدہ -متوفی ۱۸۳ھ- : ان کا شمار بھی امام ابوحنیفہؒ کے اجلۂ تلامذہ میں ہوتا ہے، جیسا کہ علامہ زاہد کوثری نے فقه اهل العراق وحديثهم میں لکھا ہے۔

۸- وکیع بن الجراح -متوفی ۱۹۷ھ- : حدیث وروایت کے باب میں نہایت اونچا مقام رکھتے تھے، اسی کے ساتھ زہد وعبادت میں بھی مشہور تھے، ان کے بارے میں یحییٰ بن معین کہتے ہیں:

مارأيت مثل وكيع، وكان يفتي برأي أبي حنيفة[1].

میں نے وکیع جیسا شخص نہیں دیکھا، اور وہ ابوحنیفہ کی رائے کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے۔

۹- یحییٰ بن سعید قطان -متوفی ۱۹۸ھ- : روایت حدیث نیز جرح وتعدیل کے مسلّم الثبوت امام تھے، ان کے بارے میں بھی یحییٰ بن معین نے فرمایا ہے:

وكان يحيىٰ بن سعيد يذهب في الفتوىٰ إلى قول الكوفيين ويختار قوله من أقوالهم، ويتبع رأيه من بين أصحابه[2].

---
(۱) مغانی الاخیار: ۱۳۶/۳　　(۲) تہذیب الکمال: ۳۴۲/۷

۱۰-یحییٰ بن معین-متوفی ۲۳۳ھ- : امام ابوحنیفہ کی تعریف وتوصیف میں ان کے اقوال اس سے پہلے نقل کیے جا چکے ہیں، اور معلوم ہو چکا ہے علم جرح وتعدیل کے امام، مشہور محدث اور امام بخاری وغیرہ کے مشائخ میں تھے، یہ بہت متشدد اور کٹر حنفی تھے، ان کے بارے میں حافظ ذہبی جیسے مؤرخ اور اسماء الرجال کے ماہر نے اپنی کتاب **الرواة الثقات المتكلم فيهم بما لايوجب ردّهم** میں لکھا ہے:

كان من الحنفية الغلاة في مذهبه وإن كان محدثاً.

محدث ہونے کے باوجود ان حنفی لوگوں میں تھے، جو اپنے مذہب کے معاملہ میں بہت پختہ تھے۔

ابن معین کا کہنا ہے کہ:

القراءة عندي قراءة حمزة، والفقه فقه أبي حنيفة، على هذا أدركتُ الناس[1].

میرے نزدیک قرأۃ حمزہ کی قرأۃ ہے، اور فقہ ابوحنیفہ کا فقہ ہے، اسی پر میں نے لوگوں کو پایا ہے۔

مذکورہ بالا اہل علم اور ائمہ حدیث کے نام بہت احتیاط اور اختصار کے ساتھ دیے گئے ہیں، اور صرف ان ائمۂ فن کے نام ذکر کیے گئے ہیں، جن کی علم حدیث میں امامت مسلّم تھی، حضرت امام ابوحنیفہؒ کے جو خاص تلامذہ اور شاگردان با اختصاص ہیں، مثلاً: امام ابو یوسف، امام محمد، امام زفر اور امام حسن بن زیاد وغیرہ کے نام قصداً نہیں ذکر کیے گئے ہیں، آخر میں اسلامی تاریخ کے کچھ چوٹی کے مصنفین کی عبارتیں نقل کر کے اس تحریر کو ختم کرنا چاہتا ہوں، علامہ ذہبی نے سیر اعلام النبلاء (۳۹۰/۶) میں لکھا ہے:

الإمام، فقيه الملة، عالم العراق.

پھر صفحہ ۳۹۲ پر لکھا ہے:

وعني بطلب الآثار، وارتحل في ذلك، وأما الفقه والتدقيق في الرأي وغوامضه، فإليه المنتهى والناس عليه عيال في ذلك.

امام ذہبی ہی نے یہ بھی لکھا ہے:

---

(۱) وفیات الاعیان: ۲۰۳/۳، الوافی بالوفیات: ۹۰/۲۷

الإمامة في الفقه ودقائقه مسلَّمة إلى هذا الإمام، وهذا أمر لا شک فيه
وليس يصح في الأذهان شئ إذا احتاج النهار إلى دليل

اورانھوں نے تاریخ الاسلام (۳/۹۹۱) میں لکھا ہے:

الإمام العلم، الفقيه، وكان معدوداً في الأجواد الأسخياء والألباء الأذكياء، مع الدين والعبادة والتهجد وكثرة التلاوة وقيام الليل رضى الله عنه.

اور تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے:

أبو حنيفة الإمام الأعظم فقيه العراق، .... حدَّث عنه وكيع، ويزيد بن هارون، وسعد بن الصلت، وأبو عاصم، وعبد الرزاق، وعبيد الله بن موسى، وأبو نعيم، وأبو عبد الرحمن المقرئ وبشر كثير. وكان إماماً، ورعاً، عالماً، عاملاً، متعبداً، كبير الشان، لا يقبل جوائز السلطان، بل يتّجر ويتكسب[(۱)].

علامہ ابن الاثیر جزری نے جامع الاصول کے خاتمہ میں لکھا ہے:

ولو ذهبنا إلى شرح مناقبه لأطلنا الخطب ولم نصل إلى الغرض، فإنه كان عالماً زاهداً ورعاً تقياً إماماً في علوم الشريعة مرضياً[(۲)].

اگر ہم امام صاحب کے اوصاف اور خوبیاں بیان کرنے لگیں تو بات بہت لمبی ہو جائے گی، اور ہمارا مقصد فوت ہو جائے گا، مختصر یہ کہ وہ عالم، زاہد، پرہیزگار، خدا ترس، علوم شریعت کے امام اور پسندیدہ انسان تھے۔

اور مشہور مؤرخ ومحدث ومفسر حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے:

هو الإمام أبو حنيفة...... فقيه العراق وأحد أئمة الإسلام، والسادة الأعلام، وأحد أركان العلماء، وأحد الأئمة الأربعة أصحاب المذاهب المتبوعة، وهو أقدمهم وفاةً، لأنه أدرک عصر الصحابة، ورأى أنس بن

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ: ۱/۱۵۹ (۲) تلخیص خواتم جامع الاصول: ۴۳۲، تحقیق حضرت محدث الاعظمی

مالک[1]۔

اور شہرۂ آفاق مورخ وادیب وعلامہ قاضی ابن خلکان نے لکھا ہے:

وكان عالماً عاملاً زاهداً عابداً ورعاً تقياً كثير الخشوع دائم التضرع إلى الله[2].

عالم، عابد، زاہد، عبادت گزار، پرہیزگار، خداترس، بہت زیادہ خوف خدا رکھنے والے، اور اللہ کے سامنے ہمیشہ الحاح وزاری کرنے والے تھے۔

امام صاحب پر کیے جانے والے اعتراضات اور جرح وقدح کا شکوہ:

کچھ خاص اسباب کی بنا پر امام صاحب کے ساتھ بعض لوگوں کی طرف سے غیر منصفانہ رویہ اختیار کیا گیا، اور ان کے اوپر ایسے اعتراضات اور جرحیں کی گئیں، جو بالکل بے بنیاد، غلط اور باطل تھیں۔ علماء اسلام کی طرف سے ان اعتراضات یا جرحوں کا بھرپور اور مدلل جواب دیا گیا ہے، اور ایک ایک اعتراض کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیے گئے ہیں، امام صاحب پر ہونے والے ناروا حملوں کو دیکھ کر خود شافعی علما کھڑے ہوئے اور انھوں نے امام صاحب کے دفاع میں کتابیں لکھیں، حافظ جلال الدین سیوطی شافعی-متوفی ۹۱۱ھ- کی **تبييض الصحيفة في مناقب الإمام أبي حنيفة**، علامہ محمد بن یوسف صالحی دمشقی شافعی-متوفی ۹۴۲ھ- کی **عقود الجمان في مناقب الإمام الأعظم أبي حنيفة النعمان** اور علامہ ابن حجر ہیتمی مکی شافعی-متوفی ۹۷۴ھ- کی **الخيرات الحسان في مناقب الإمام الأعظم أبي حنيفة النعمان** اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

اس کے علاوہ بہت سے مصنفین نے اپنی کتابوں میں امام صاحب پر کیے جانے والے اعتراضات اور جرحوں کا شکوہ کیا ہے اور ان کو یکسر ناقابل التفات وغیر معتبر قرار دیا ہے، مثال کے طور شافعی عالم ومورخ وادیب علامہ ابن خلکان-متوفی ۶۸۱ھ- نے وفیات میں لکھا ہے:

ومناقبه وفضائله كثيرة، وقد ذكر الخطيب في تاريخه منها شيئاً كثيراً، ثم أعقب ذلك بذكر ما كان الأليق في تركه والإضراب عنه، فمثل هذا الإمام لا يُشكُّ في دينه، ولا في ورعه وتحفُّظه[3].

امام ابوحنیفہؒ کے مناقب وفضائل بہت زیادہ ہیں، خطیب نے اپنی تاریخ (تاریخ

---

(۱) البدایہ والنہایہ: ۱۰/۱۱۴ (۲) وفیات الاعیان: ۳/۲۰۲ (۳) وفیات الاعیان: ۳/۲۰۳

بغداد) میں ان میں سے بہت سے مناقب کا ذکر بھی کیا ہے، لیکن اس کے بعد (امام صاحب کے متعلق) ایسی باتیں ذکر کی ہیں، جن کو نہ لکھنا اوران سے صرف نظر کرنا مناسب تھا، اس جیسے امام کی دین داری، پرہیزگاری اوراحتیاط میں شک نہیں کیا جاسکتا۔

شیخ محمد عوامہ نے کاشف کے حاشیہ میں حافظ ذہبی کی تذھیب التذھیب کے حوالے سے ان کا یہ قول نقل کیا ہے:

وقد أحسن شيخنا أبو الحجاج -المزي- حيث لم يُورد شيئاً يلزم منه التضعيف.

ہمارے شیخ ابوالحجاج مزی نے یہ بہت اچھا کیا کہ کوئی ایسی بات نہیں نقل کی، جس سے ان کی تضعیف لازم آتی۔

پھر شیخ عوامہ نے اسی کتاب کے حاشیے میں حافظ سخاوی کی کتاب **الجواهر والدرر** سے حافظ ابن حجر کا یہ قول نقل کیا ہے:

إن الإمام وأمثالَه ممن قفزوا القنطرة، فما صار يؤثر في أحد منهم قول أحد، بل هم في الدرجة العليا التي رفعهم الله تعالى إليها، من كونهم أئمةً متبوعين يُقتدى بهم، فليُعتمد هذا، والله ولي التوفيق.

یعنی امام صاحب اوران کے ہم مثل افراد ان لوگوں میں سے ہیں جو (جرح وتعدیل کے) پُل سے گزر چکے ہیں، لہذا ان کے بارے میں کسی کی بات کوئی حیثیت نہیں رکھتی، بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالی نے انتہائی بلند مقام تک پہنچا دیا ہے، کہ ان کو ایسا امام وپیشوا بنا دیا گیا ہے، جن کی اقتدا اور پیروی کی جاتی ہے، میری اس بات پر بھروسہ کرنا چاہئے، اور توفیق دینے والی ذات تو اللہ ہی کی ہے۔

اور محدث وحافظ وعلامہ ابن الاثیر جزری -متوفی ۶۰۶ھ- نے خاتمۂ جامع الاصول میں امام صاحب پر کیے جانے والے اعتراضات کو غلط اور بے بنیاد قرار دیتے ہوئے ان کے دفاع میں جو لکھا ہے، اس کا ترجمہ پیش کر دینا چاہتا ہوں:

''خلق قرآن، مسئلۂ تقدیر وارجاء سے متعلق ان کی طرف (امام صاحب کی طرف) کچھ ایسے اقوال منسوب کیے گئے ہیں، جن سے ان کی شان بہت ہی بلند وبرتر ہے، جن

لوگوں نے یہ باتیں کہی ہیں ان کے ذکر کی ضرورت نہیں، لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ امام صاحب کی ذات ان الزامات سے پاک اور بلند تر ہے، ان الزامات سے پاک اور بری ہونے کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ اللہ پاک نے آپ کو چار دانگ عالم میں شہرت عطا کی ہے، اور آپ کو وہ علم عطا فرمایا ہے جو پورے روئے زمین پر پھیلا ہوا ہے۔ آپ کے مذہب، آپ کے فقہ اور آپ کے قول وفعل کو اختیار کیا گیا ہے، اگر خدا کا کوئی بھید اور اس کی رضا نہ ہوتی تو دنیا کے آدھے یا آدھے سے قریب مسلمانوں کو ان کی تقلید اور ان کی رائے ومذہب پر عمل کرنے کو باقی نہ رکھتا، حتی کہ ساڑھے چار سو سال سے ان کی رائے اور ان کے فقہ کے مطابق اللہ کی عبادت ہوتی چلی آرہی ہے، یہ ان کے مذہب ومسلک اور ان کے عقیدے کے صحیح ہونے کی انتہائی ٹھوس اور مضبوط دلیل ہے، اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ ان کے بارے میں جو (غلط) خیال نقل کیا جاتا ہے، ان کی ذات اس سے بری ہے۔ ....خلاصۂ کلام یہ کہ ابوحنیفہ جیسا انسان اور اسلام میں ان کا جو مقام ہے، اس کے پیش نظر ان کی طرف سے عذر پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے"(۱)۔

میری یہ تحریر خلاف توقع بہت زیادہ طویل ہوگئی، لیکن اس کو ختم کرنے سے پہلے جلیل القدر حافظ حدیث، فقیہ اور اپنے دور کے شیخ الاسلام عبدالرحمٰن بن عمرو اوزاعی -متوفی ۱۵۷ھ- اور تاریخ اسلام کی مایۂ ناز ہستی حضرت عبداللہ بن مبارک -متوفی ۱۸۱ھ- کے درمیان ہونے والی ایک گفتگو کو نقل کردینا چاہتا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ:

امام اوزاعی نے حضرت عبداللہ بن مبارک سے کہا کہ کوفہ میں ابوحنیفہ نام کا یہ کون بدعتی پیدا ہوا ہے؟ عبداللہ بن مبارک نے یہ سن کر ان کی خدمت میں کچھ مشکل مسائل پیش کیے، جب امام اوزاعی نے دیکھا کہ یہ مسائل نعمان بن ثابت کے اجتہاد کیے ہوئے ہیں، تو پوچھا کہ یہ نعمان بن ثابت کون ہیں؟ ابن مبارک نے کہا کہ ایک بزرگ آدمی ہیں جن سے عراق میں میری ملاقات ہوئی تھی۔ اوزاعی نے کہا کہ: یہ تو بڑے اچھے شیخ ہیں، تم جاؤ اور ان سے اور علم حاصل کرو۔ عبداللہ بن مبارک نے کہا کہ یہ وہی ابوحنیفہ ہیں جن سے (علم حاصل کرنے سے) آپ نے مجھے منع کیا تھا۔ پھر جب امام اوزاعی کی امام ابوحنیفہؒ سے مکہ میں ملاقات ہوئی، تو ان سے ان ہی مسائل پر گفتگو کی، اس

(۱) تلخیص خواتم جامع الاصول: ۴۳۳

وقت ابوحنیفہ نے اس سے زیادہ وضاحت سے بیان کیا جتنا ابن المبارک نے لکھا تھا، جب دونوں رخصت ہوئے تو امام اوزاعی نے حضرت ابن المبارک سے فرمایا:

غبطتُ الرجلَ بكثرة علمه ووفور عقله، وأستغفر الله تعالى لقد كنت في غلط ظاهر، الزم الرجلَ فإنه بخلاف ما بلغني عنه[1].

امام اوزاعی کہتے ہیں کہ: مجھے ابوحنیفہ کا کثرت علم اور وفور عقل دیکھ کر ان پر رشک ہونے لگا، اور میں اللہ تعالی سے مغفرت طلب کرتا ہوں کہ میں کھلی ہوئی غلطی میں تھا، تم ان سے چمٹ جاؤ، مجھے ان کے بارے میں جو کچھ معلوم ہوا تھا ان کی شان اس سے بالکل مختلف ہے۔

☆......☆......☆

صفحہ ۶۵ کا بقیہ کا گنجینہ تھا، خود مالک کتب خانہ -اصمعی- کا بیان ہے کہ جب ہارون رشید -رحمۃ اللہ علیہ- کے ساتھ ہم رقہ کے لیے نکلے، تو ہارون نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تمھارے ساتھ تمھاری کچھ کتابیں ہیں؟ میں نے عرض کیا: جی! جو آسانی سے آسکیں وہ میں نے لے لیں۔ پوچھا: کتنی کتابیں ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ اٹھارہ صندوق، ہارون نے کہا: کہ اتنی جب ہلکی ہیں تو پورا وزن ہوتا تو کتنی ہوتیں؟ میں نے عرض کیا کہ اس کے کئی گنا زیادہ ہوتیں۔ تو ہارون کو اس پر بہت تعجب ہوا۔"[1]

۵- وزیر محمد بن عبدالملک زیات متوفی ۲۳۳ھ = ۸۴۷ء کا کتب خانہ:

ادیب اور معتصم، واثق اور متوکل -رحمہم اللہ تعالی- کا وزیر تھا، سامراء میں اس کا ایک بہت وسیع وعریض کتب خانہ تھا، اس میں وہ کتابیں بھی تھیں جو یونانی سے عربی میں ترجمہ کی گئی تھیں، اس کتب خانے کی ایک کتاب کی بابت جاحظ سے نقل کرکے کئی ایک مؤرخین نے لکھا ہے کہ: "میں نے معتصم کے وزیر محمد بن عبدالملک زیات کے پاس جانے کا ارادہ کیا، میں نے اس کو کوئی چیز ہدیہ کرنے کے بارے میں سوچا، تو اس کو ہدیہ کرنے کے لیے مجھے اس کتاب جیسی کوئی چیز نہیں ملی، اور میں نے اس کو فراء کے ترکہ سے خریدا تھا، تو وزیر نے کہا کہ بخدا میرے لیے اس سے زیادہ پسندیدہ کوئی ہدیہ نہیں ہے۔"[2]

☆......☆......☆......☆......☆

---

(۱) الخیرات الحسان: ۶۸

(۱) الأغاني: ۵/ ۳۰۲

(۲) تاریخ بغداد: ۱۲/ ۱۹۶، وفیات الاعیان: ۱/ ۴۶۳

اسلامی کتب خانے

(آٹھویں قسط)

از: دکتور علی بن علی ابو یوسف جہنی ترجمہ وتلخیص: مسعود احمد الاعظمی

عہد اسلامی کے پرائیوٹ کتب خانے

یہ وہ کتب خانے ہیں جن کو اہل علم وادب اپنے گھروں میں اس لیے قائم کرتے ہیں کہ اپنی ضرورت کے مطابق ان کے ذریعے علوم وفنون کا اکتساب کرسکیں، یہ لوگ ان میں اپنا مال خرچ کر کے کتابیں مہیا کرتے ہیں، اوران کی نگہداشت اور دیکھ ریکھ کرتے ہیں۔

ان کتب خانوں کے''خاص'' (پرائیوٹ) نام ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ متعین افراد کے ساتھ مخصوص ہوتے ہیں، جن کو وہ اپنے فائدے اور مقصد کے لیے اور زیادہ تر اپنے ذاتی مال سے قائم کرتے ہیں۔

اگر چہ بعض لوگ اپنے مملوکہ کتب خانے کے نفع کو صرف اپنی ذات تک محدود نہیں رکھتے، بلکہ دوسروں کو بھی اس سے استفادہ کو موقع فراہم کرتے ہیں، اسی وجہ سے بعض محققین اپنی کتابوں کا ایک حصہ ان کتب خانوں کے تعارف کے لیے مخصوص کردیتے ہیں، اوران کے لیے''پرائیوٹ اور پبلک کتب خانے'' کا عنوان قائم کرتے ہیں، اس قسم کے کتب خانے عالم اسلامی کے چپے چپے میں اور وسیع پیمانے پر منظّم طور پر پھیلے ہوئے ہیں، جو اپنی تنظیم وترتیب کے اعتبار سے بسا اوقات دوسری قسم کے کتب خانوں پر فوقیت رکھتے ہیں، اس لیے یہ مشکل ہے کہ تم کو کوئی عالم یا ادیب ایسا ملے جس کے پاس مراجعت اور مطالعہ کے واسطے کوئی کتب خانہ نہ ہو۔

اسلامی تاریخ کا سب سے پہلا کتب خانہ:

حکام ووزراء علماء وادباء اور اہل ثروت بڑی سے بڑی تعداد میں کتابیں بہم پہنچانے کے

خواہش مند ہوا کرتے تھے، ان کو یہ شوق دامن گیر رہتا تھا کہ ان کے اپنے کتب خانے ہوں، مساجد کے کتب خانوں کے دوش بدوش اس قسم کے کتب خانے اسلامی تاریخ میں سب سے پہلے ظہور میں آنے والے کتب خانے تھے۔

چنانچہ صحابہ وتابعین -رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین- کے مکانات قرآن کریم کے نسخوں اور حدیث شریف کے نوشتوں پر مشتمل ہوا کرتے تھے، وہ اپنے گھروں میں کتابیں جمع کرتے اوران کی حفاظت کرتے، اور یہی عہد مسلمانوں کے پرائیوٹ کتب خانوں کا نقطۂ آغاز ہے، کیونکہ جلیل القدر صحابی حضرت سعد بن عبادہ انصاری رضی اللہ عنہ متوفی ۱۵ھ کے پاس ایک کتاب یا چند نوشتے تھے، جن میں آنحضرت ﷺ کی احادیث طیبہ مبارکہ لکھی ہوئی تھیں، اوران صحابی کے صاحبزادے نے اپنے والد کے نوشتوں سے آنحضرت ﷺ کے کچھ اعمال کو روایت کیا ہے۔ (۱)

سلف صالحین اور کتابوں سے ان کی دلچسپی:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ متوفی ۳۲ھ کے پاس آپ کا مشہور نسخہ قرآن کریم اورآپ کے لکھے ہوئے کچھ دوسرے نوشتے تھے۔ (۲)

آنحضرت ﷺ کے آزاد کردہ غلام حضرت ابورافع متوفی ۳۵ھ کے پاس ایک نوشتہ تھا جس میں نماز شروع کرنے کا طریقہ تحریر تھا، اس نوشتے کو آپ نے فقہاء سبعہ میں سے ایک حضرت ابوبکر عبدالرحمٰن بن حارث متوفی ۹۴ھ کو عطا فرمادیا تھا۔ (۳)

حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ تعالیٰ عنہا متوفاۃ ۳۸ھ کے پاس ایک نوشتہ تھا، جس میں انھوں نے آنحضرت ﷺ کی کچھ حدیثیں لکھ رکھی تھیں۔ (۴)

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ متوفی ۴۰ھ کا وہ صحیفہ مشہور ومعروف ہے جس کو آپ نے اپنی تلوار میں رکھ چھوڑا تھا، جس میں اونٹوں کی دیت اور زخموں کے کچھ احکام قلم بند تھے۔ (۵)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ متوفی ۵۷ھ کے پاس متعدد ایسے نوشتے تھے جن کے اندر آنحضرت

---

(۱) ابن عبدالبر، جامع بیان العلم وفضله: ۷۲/۱
(۲) خطیب محمد عجاج، السنة قبل التدوین: ۳۴۵
(۳) خطیب بغدادی، الكفاية في علم الرواية: ۳۳۰
(۴) خطیب محمد عجاج، اصول الحدیث: ۱۹۲
(۵) خطیب عجاج، السنة قبل التدوین: ۳۴۶

ﷺ کی حدیثیں درج تھیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اپنے نوشتوں کی حفاظت کے واسطے ان کو ایک حلقہ دار صندوق میں بند کر کے رکھا کرتے تھے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ متوفی ۶۸ھ کے پاس اتنی بڑی تعداد میں کتابیں تھیں کہ ایک اونٹ پر آتی تھیں۔[۱]

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے پاس بھی کچھ کتابیں تھیں، جب آپ بازار جاتے تو ان کا مطالعہ فرماتے رہتے۔[۲]

اور حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ متوفی ۹۳ھ کی کتابیں واقعہ حرہ میں جل گئیں تو اس قدر غم زدہ ہوئے کہ فرمایا کرتے کہ کاش میرے اہل وعیال اور مال کے بدلے میں میری کتابیں رہ گئی ہوتیں۔[۳]

بایں ہمہ طبری - رحمۃ اللہ علیہ - نے تاریخ الأمم والملوک میں حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے اقوال اور ان کے نوشتوں سے جستہ جستہ اقتباسات نقل کیے ہیں، جو ایسے سوالوں کے جوابات ہیں، جن کو عبدالملک بن مروان رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی خدمت میں پیش کیا تھا، نیز الموسوعۃ الإسلامیۃ میں مذکور ہے کہ انھوں نے ایک اہم کتب خانہ جمع کر رکھا تھا، جس میں تاریخی اور فقہی موضوعات پر بہت سی کتابیں تھیں۔[۴]

مشہور اور بزرگ تابعی ابو قلابہ عبداللہ بن زید جرمی رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۱۰۴ھ نے ایوب سختیانی رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۱۳۱ھ کے لیے اپنی کتابوں کی وصیت کر رکھی تھی، تو وہ اونٹ کے بوجھ کے بقدر بار کر کے لائی گئیں۔[۵]

حسن بصری متوفی ۱۱۰ھ رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں اعمش نے فرمایا ہے کہ ہمارے پاس کچھ کتابیں ہیں جن کی ہم نگہداشت کرتے ہیں۔[۶]

مذکورہ بالا مثالوں اور نمونوں سے یہ بات ثابت ہو چکی کہ اس قسم کے پرائیوٹ کتب خانے

---

(۱) طبقات ابن سعد: ۲۱۶/۵ (۲) ابن جماعۃ الکنانی، الجامع لأخلاق الراوي وآداب السامع: ۱۰۰

(۳) طبقات: ۱۳۳/۷، جامع بیان العلم: ۱/۱۷ (۴) الموسوعۃ الاسلامیہ (مادہ عروہ)

(۵) طبقات: ۲۱۶/۵ (۶) وفیات الاعیان: ۳۱۷/۳

تاریخ اسلام ی کے ابتدائی عہد سے معروف تھے، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پہلی صدی ہجری کے نصف ثانی سے تدوین وتصنیف کے کام میں وسعت پیدا ہونے لگی، جس میں کتابوں اور تالیفات کی اس قدر کثرت ہوئی کہ خلفاء بنی امیہ نے ان کے لیے مخصوص کتب خانے قائم کیے۔

بصرہ کے ایک طبیب ماسرجویہ کے تذکرے میں ابن جُلجل نے لکھا ہے کہ انھوں نے اہون ابن اعین عشی کی کتاب کی عربی میں تفسیر اور نقل کی خدمت انجام دی اور اس کو خلیفۃ المسلمین عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے کتابوں کے گنجینے میں پایا، تو اس کو نکالنے کا حکم دیا، اور اس کو اپنی جائے نماز میں رکھا، پھر مسلمانوں کے استفادہ کے لیے اس کو منظر عام پر لانے کے لیے استخارہ کیا، چنانچہ جب ان کو شرح صدر ہوگیا، تو اس کو نکال کر لوگوں میں پھیلایا۔

اس بیان میں اس بات کی طرف صریح اور صاف اشارہ ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سے پہلے خلفاء بنی امیہ کے پاس کتابوں کے ذخیرے تھے، اور یہ کہ وہ صرف ان ہی تصانیف پر مشتمل نہیں تھے، جو اصلاً عربی زبان میں لکھی گئی تھیں، بلکہ کچھ ایسی کتابوں پر بھی مشتمل تھے جو دوسری زبانوں سے عربی میں منتقل اور ترجمہ کی گئی تھیں، اور یہ بھی کہ بعض خلفاء ان میں سے مفید کتابوں کی اشاعت کو اپنا فرض سمجھتے تھے، جیسا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے کیا تھا۔

دوسری صدی ہجری کے اوائل کے ساتھ کتابوں کا پھیلاؤ:

واقعہ یہ ہے کہ ہم ابھی دوسری صدی ہجری کے اوائل تک پہنچتے نہیں کہ ہم کو لوگوں کے درمیان کتابوں کا فروغ اور پھیلاؤ نظر آنے لگتا ہے، اور ان کی فراہمی اور ان کی حفاظت کی فکر روز افزوں دکھائی دینے لگتی ہے، چنانچہ ابن خلکان علیہ الرحمہ امام ابن شہاب زہری رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۱۲۴ھ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ وہ جب اپنے گھر بیٹھتے تھے تو اپنی کتابیں اپنے اردگرد رکھ لیتے تھے، اور دنیا ومافیہا سے بے خبر ہوکر ان کے اندر منہمک ہوجاتے تھے، حتی کہ ایک دن ان کی بیوی نے ان سے کہا کہ: ”واللہ یہ کتابیں تو میرے لیے تین سوکنوں سے زیادہ سخت ہیں۔“[1]

امام زہری رحمۃ اللہ علیہ کی کتابیں بہت بڑی تعداد میں تھیں، یہاں تک کہ وہ ولید بن یزید ابن عبدالملک (۸۸-۱۲۶ھ) کے قتل کے بعد اس کے خزانوں سے چوپایوں پر منتقل کی گئیں۔[2]

(۱) وفیات الاعیان: ۳/۳۱۷ (۲) تاریخ الاسلام للذہبی: ۵/۱۴۱

عمر بن علاء بصری رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۱۵۴ھ کی کتابیں ان کے ایک گھر میں چھت تک بھری ہوئی تھیں۔ (۱)

امام زاہد سفیان ثوری علیہ الرحمۃ متوفی ۱۶۱ھ کے پاس بھی بہت ساری کتابیں تھیں۔ (۲)

اس طرح اسلام کے ابتدائی دور میں صحابہ کرام اور تابعین عظام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے پاس کتابیں اور کتب خانے ہونے اور ان کی حفاظت ونگہداشت، ان کو عاریت پر دینے اور طلب گاروں کو فراہم کرنے کی بہت سی مثالیں اور نمونے موجود ہیں، جن کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔

دوسری صدی ہجری تدوین کی اس سرگرمی سے روشناس ہوتی ہے، جو حدیث نبوی اور اس کے بعد مغازی وسیر کے جمع وتدوین میں مجسم نظر آتی ہے، پھر انسانی علوم کی مختلف فروع میں پے در پے کتابیں تالیف ہونے لگتی ہیں، اسی کے ساتھ کتب خانوں اور اسلامی کلچر کے فروغ اور توسیع کے لیے ترجمہ اور تعریب کی سرگرمی بھی شروع ہو جاتی ہے، اور ترجمہ نگاری نے فتوحات کے بعد دوسری قوموں اور تہذیبوں جیسے مصر وشام کی یونانی تہذیب، ایران کی فارسی تہذیب اور عراق وعلاقۂ دجلہ وفرات کی سریانی تہذیب کے ساتھ مسلمانوں کے اتصال وارتباط میں قاصد کا کام انجام دیا۔

اسی طرح کاغذ سازی کی صنعت کی ایجاد نے کتاب کی صنعت کو فروغ دینے میں مہمیز لگانے کا کام کیا، اس لیے کہ اس سے کتابوں کی قیمت میں کمی آئی، اور بلفظ دیگر عام لوگوں کو کتابیں دستیاب ہو گئیں۔

اس سے پہلے کتابیں چمڑوں اور بردی کے پتوں پر لکھی جاتی تھیں، لیکن ان کی وجہ سے کتابیں بہت گراں قیمت تھیں، اور گرانی کی وجہ سے لوگ کتابیں خریدنے اور ان کو جمع کرنے سے قاصر تھے۔

مسلمان ماوراء النہر کے علاقے کو فتح کرنے کے بعد، اور ۱۳۳ھ کے معرکۂ ''طراز'' میں چینی لشکر پر فتح یاب ہونے کے بعد کاغذ سازی کی صنعت سے آشنا ہوئے، اور عباسی خلیفہ ہارون رشید رحمۃ اللہ علیہ (۱۷۱ھ-۱۹۳ھ) کے عہد خلافت سے بغداد میں کاغذ کا استعمال عام ہو گیا۔ (۳)

---

(۱) معجم الادباء: ۴/۲۱۷ (۲) الفہرست لابن الندیم: ۳۱۵

(۳) الکامل لابن الاثیر: ۵/۴۴۹، مقدمہ ابن خلدون: ۳۸۲-۳۸۳

بلاد اسلام میں کاغذ سازی کی صنعت کے داخل ہونے کے بعد یہ صنعت بہت تیزی سے اشاعت پذیر ہوئی، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ عالم اسلام کے بہت سے شہروں میں کاغذ کے کارخانے قائم کیے گئے، اور پانچویں صدی ہجری (گیارہویں صدی عیسویں) کے بعد سے سارا یورپ اپنی کاغذ کی ضرورت عالم اسلام سے پوری کرتا ہوا نظر آتا ہے، چنانچہ اس کی ضرورت مشرق میں بغداد وقاہرہ اور مغرب میں اندلس کے کارخانوں سے پوری ہوتی تھی۔

ساتویں صدی ہجری میں کتاب کی لاگت:

ساتویں صدی ہجری (تیرہویں صدی عیسویں) میں کتابوں کی لاگت میں بہت زیادہ کمی آگئی تھی، چنانچہ یاقوت حموی مرو کے کتب خانہ ضمیر یہ سے کتابوں کو عاریت پر لینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ: ''کتابیں بسہولت دستیاب تھیں، میرے مکان میں ہمہ وقت دوسو ۲۰۰ کتابیں موجود رہا کرتی تھیں، اور بیشتر کتابیں کسی رہن کے بغیر حاصل ہوجاتی تھیں، جن کی قیمت دو دو سو دینار تک ہوجاتی تھی''۔[1] اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک کتاب کی اوسط قیمت صرف ایک دینار ہوا کرتی تھی۔

کاغذ کی اشاعت اور کاغذ سازی کی صنعت کے ظہور کا ثمرہ یہ ہوا کہ تصنیف وتالیف کی سرگرمی حیرت انگیز حد تک ترقی کرگئی۔ اور اس کے نتیجے میں اسلامی سوسائٹی میں ایک نئے طبقے کا ظہور ہوا، جو ''وراقوں'' کے نام سے معروف تھا، جس کا تعارف کراتے ہوئے ابن خلدون نے لکھا ہے کہ ''اس کا کام کتابوں کو نقل کرنا، ان کی تصحیح کرنا، جلد سازی کرنا اور دیگر مکتبی ودفتری امور ہیں''۔

اگر کاغذ کو فروغ نہ حاصل ہوا ہوتا تو ہم کو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۲۰۴ھ کی سو سے زیادہ اور جابر بن حیان متوفی ۲۰۰ھ کی تین سو سے زیادہ کتابیں نہ ملتیں، اور جاحظ ۱۲۰ سے زیادہ کتابیں -جن کو اس نے خود اپنی کتاب الحیوان کے مقدمہ میں ذکر کیا ہے- نہ لکھ سکتا، اور محمد بن زکریا رازی طبیب علیہ الرحمۃ متوفی ۳۱۱ھ کی کتابوں کی تعداد اڑھائی سو (۲۵۰) تک نہ پہنچتی۔

واقعہ یہ ہے کہ اس دور میں تصانیف کی کثرت تعداد حیرت انگیز حد تک پہنچ چکی تھی، اگر کسی کو اس عہد زریں میں عربی تصانیف وتالیفات کی گرم بازاری کی صحیح تصویر دیکھنا ہو، تو محمد بن اسحاق

---

(۱) معجم البلدان: ۴/۵۰۹-۵۱۰

معروف بہ ابن الندیم متوفی ۳۸۰ھ کی الفہرست کا مطالعہ کرے، جو اپنے زمانے میں بغداد کا مشہور وراق تھا، اور سب سے پہلا شخص تھا جس نے اپنی عظیم الشان تصنیف ''الفہرست'' کے ذریعے اسلامی ببلیوگرافی وضع کی، اور اس وقت تک جتنی تصانیف معرض وجود میں آئی تھیں ان سب کا اپنے علم کے مطابق احصاء واحاطہ کیا ہے، جن کی تعداد تقریباً ۶۰۰۰ ہزار اور جلدوں کے اعتبار سے دس ہزار ۱۰۰۰۰ تک پہنچتی ہے، لیکن اس عظیم فکری سرمائے کا بہت کم حصہ- جو چند سو سے زیادہ نہیں ہے- ہم تک پہنچ سکا ہے، باقی ہزاروں کتابیں اور تصانیف آتش زنی یا رہزنی کی نذر ہو گئیں۔

حالانکہ ابن الندیم نے اپنی کتاب میں اپنے زمانے تک تصنیف کی جانے والی تمام کتابوں کا استیعاب نہیں کیا ہے، بلکہ اہل مغرب واندلس کی بہت سی کتابیں اس سے چھوٹ گئی ہیں۔

اسی طرح حاجی خلیفہ کی ''کشف الظنون'' میں بارہ ہزار ۱۲۰۰۰ سے زیادہ کتابوں کا تذکرہ ہے، جب کہ شروح ومختصرات اور جو کتابیں ضائع ہو گئی ہیں، اور جن کا ذکر رہ گیا ہے، وہ ان بارہ ہزار کے علاوہ ہیں۔

اس عہد میں- دوسری صدی عیسوی کے وسط سے چوتھی صدی ہجری کے وسط تک- صرف تالیفات کی کثرت اور حجم کی ضخامت ہی پر توجہ مبذول نہیں تھی، بلکہ اس کے ساتھ کتب بینی اور فراہمیٔ کتب کا بھی غیر معمولی شوق وشغف تھا، وہ لوگ کتابیں خریدنے اور ان کے فراہم کرنے پر بہت دریا دلی سے خرچ کیا کرتے تھے، اور اس کی اس قدر مثالیں ہیں کہ ان کو شمار کرنا مشکل ہے، بعض مثالیں اوپر گزر بھی چکی ہیں۔

تالیف وترجمہ کی گرم بازاری کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف افراد کے مخصوص کتب خانوں اور دوسری طرف خلفاء کے کتب خانوں کا ظہور ہوا۔

دیورانت اس دور کی امتیازی شان کی تصویر کشی کرتے ہوئے لکھتا ہے: ''دنیا کے کسی بھی ملک میں فراہمیٔ کتب کا شغف- باستثناء عہد ہوانگ چین کے- اس درجے کو نہیں پہنچا، جہاں تک آٹھویں، نویں، دسویں اور گیارہویں صدی عیسوی میں اسلام کا پہنچ چکا تھا، ان چار صدیوں کے دوران اسلام اپنی ثقافتی زندگی کی پوری بلندی کو پہنچ چکا تھا''۔(۱)

(۱)قصة الحضارة: ۱۳/ ۱۷۱

یہ مسلمہ حقائق میں سے ہے کہ اسلامی مملکت اپنی ابتدائی چند صدیوں ہی میں ان اقسام کے کتب خانوں سے روشناس ہو چکی تھی، جن پر عصر حاضر کی ترقی یافتہ قومیں آج فخر کرتی ہیں۔

دوسری صدی ہجری کے ختم ہونے سے پہلے پرائیوٹ کتب خانے عالم وجود میں آنا شروع ہو گئے، اور چوتھی صدی ہجری ابھی داخل بھی نہیں ہوئی تھی کہ اسلامی قلمرو میں کتب خانے پھیلے ہوئے نظر آنے لگے۔

ممالک اسلامیہ کے کتب خانے:

اسلامی ممالک میں علماء، ادباء وزراء اور انشاء پردازوں کے کتب خانے حیرت انگیز ہیں اور علم واہل علم کی طرف ان کے التفات وعنایت پر دلالت کرتے ہیں، تاریخ وادب کی کتابوں میں علماء، اطباء، حکماء، مؤرخین، لغویین اور وراقین کے کتب خانوں کے بہت سے واقعات بکھرے ہوئے ہیں، جس کی مثال نہ سابقہ قوموں میں ملتی ہے اور نہ ہی ان کی معاصر قوموں میں۔

اور چونکہ افراد کے کتب خانے بہ کثرت اور متفرق تھے، اور ایک محقق کے لیے ایسے تمام افراد کا احاطہ کرنا جو اہم اور خاص کتب خانوں کے مالک تھے، دشوار اور ان کو شمار میں لانا حد استطاعت سے باہر ہے، اور شمار کرنا اہم کام بھی نہیں ہے، اس لیے یہاں صرف ان چند کتب خانوں ہی کا ذکر ہوگا، جو اپنے مالکوں کے واسطے تحقیق وتالیف کے مرجع کا کام کرتے تھے، ان میں سے مشہور کتب خانے حسب ذیل ہیں:

۱- کتب خانۂ ابن ابی بعرۃ:

غالبًا ان پرائیوٹ کتب خانوں میں یہ قدیم ترین ہے جن کے بارے میں کسی قدر معلومات ہم کو حاصل ہوتی ہیں، ابن الندیم نے اس کے وصف میں محمد بن اسحاق متوفی ۱۵۱ھ = ۷۶۸ء علیہ الرحمۃ سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: ''شہر حدیثہ میں ایک شخص تھا، جس کا نام محمد بن حسین تھا اور ''ابن ابی بعرہ'' کے نام سے مشہور تھا، کتابیں بہت جمع کرنے والا تھا، اس کے پاس کتابوں کا ایک ایسا گنجینہ تھا، کثرت تعداد میں جس کی نظیر میری نظر سے نہیں گزری، نحو ولغت وادب اور قدیم کتابوں کے ایک بڑے حصے پر مشتمل ہے، اس کے ذخیرۂ کتب میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے شاگرد خالد بن ابی ہیاج کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن کریم کا ایک نسخہ بھی ہے، خالد کے بعد یہ نسخہ ابوعبداللہ

ابن حسانی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بھی رہ چکا ہے، میں نے اس کتب خانے میں حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کچھ یادگار چیزیں بھی دیکھی ہیں، نیز حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دست مبارک سے لکھی ہوئی متعدد امانتیں اور عہد نامے اور آنحضرت ﷺ کے دوسرے کاتبوں کے ہاتھوں کی لکھی ہوئی چیزیں بھی دیکھی ہیں۔ اور نحو ولغت کے علماء میں سے ابوعمرو بن العلاء، ابوعمرو الشیبانی، اصمعی، ابن الاعرابی، سیبویہ، فراء، اور کسائی جیسے اہل علم وفن کی تحریریں بھی میری نظر سے گزریں، اسی طرح محدثین میں سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، امام اوزاعی رحمہم اللہ وغیرہ کے نوشتے بھی دیکھنے میں آئے۔

۲-ابوعمرو بن العلاء بصری متوفی ۱۵۴ھ = ۷۷۰ء:

یاقوت حموی نے اس کتب خانے کے بارے میں ابوعبیدہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ: ''ابوعمرو قرأت وعربیت، عربوں کے واقعات اور ان کے اشعار کے بہت بڑے عالم تھے، اور ان کی کتابیں ان کے مکان میں چھت تک بھری ہوئی تھیں۔''

۳-محمد بن عمر واقدی کا کتب خانہ:

واقدی، مغازی اور سیر وفتوح کا بلند پایہ عالم تھا، مامون کے عہد خلافت میں رصافہ کے بغل میں عسکر المدی کے عہدۂ قضا پر فائز تھا، اور ۲۰۷ھ = ۸۲۲ء میں دنیا سے فوت ہوا، اس کے پاس ایک کتب خانہ تھا جس میں ہزاروں کتابیں تھیں، خطیب بغدادی -رحمۃ اللہ علیہ- نے ذکر کیا ہے کہ جب واقدی مغربی کنارے سے رصافہ منتقل ہوا تو کہا جاتا ہے کہ: ''وہ اپنی کتابیں ایک سو بیس ۱۲۰ بوجھ میں لے گیا تھا''[1] اسی طرح ابن الندیم -رحمۃ اللہ علیہ- نے واقدی کے بارے میں ایک بہترین واقعہ لکھا ہے کہ: ''واقدی نے اپنی وفات کے بعد ۶۰۰ قمطر کتابیں چھوڑی تھیں، اور ایک قمطر دو آدمیوں سے اٹھتا تھا، اس کے دو غلام تھے جو شب وروز لکھتے رہتے تھے اور اس سے پہلے وہ دو ہزار ۲۰۰۰ دینار میں فروخت کی گئی تھیں''۔

۴-اصمعی کا کتب خانہ:

اصمعی کی وفات ۲۱۶ھ = ۸۳۱ء میں ہوئی تھی، اس کا خزانہ کتابوں بقیہ صفحہ ۵۶ پر

(۱) معجم البلدان: ۵۰۹/۴-۵۱۰

صحت احادیث کا بلند ترین معیار اور اس کے ثبوت وشواہد

مولانا سراج احمد مدرسہ دار السلام، ادری

انشاء پردازی کے میدان میں نمایاں اور منفرد حیثیت رکھنے والی شخصیت رئیس القلم مولانا نظام الدین اسیر ادروی کی ذات گرامی ہے، آپ اپنے قصبہ ادری میں اپنے دولت کدہ پر طویل عرصہ سے ہیں، جب کہ آپ کی بینائی آہستہ آہستہ ساتھ چھوڑ رہی ہے، کتب بینی کی ہزار خواہش کے باوجود نہ تو آپ کتابوں سے استفادہ کر سکتے ہیں اور نہ ہی اپنی تحریر کے ذریعے علمی دنیا میں کوئی پیغام پہنچا سکتے ہیں، لیکن جب آپ کے ذوق کے مطابق کسی شخصیت کی آمد ہوتی ہے تو اسے پا کر اپنے دل و دماغ میں بسے ہوئے جواہر پارے بکھیرتے ہیں، تو لوگ اسے سن کر حیران و ششدر رہ جاتے ہیں کہ درازی عمر کے باوجود آپ کا دل و دماغ ایسے کام کر رہا ہے جیسے صحت مند آدمی کا۔ آپ کے اوپر خدا کا ایک فضل وکرم یہ بھی ہے کہ فراغت کے بعد تقریباً ۳۵ ر سال تک میدان سیاست اور صحافت سے تن من کے ساتھ اس انداز سے جڑے ہوئے تھے کہ درسی کتابوں سے کسی طرح کا کوئی تعلق اور واسطہ نہیں تھا، لیکن عرصۂ دراز کے بعد جب آپ درس وتدریس اور تصنیف وتالیف سے وابستہ ہوئے، تو ایسا ناقابل فراموش اور گراں قدر علمی کارنامہ انجام دیا کہ علمی دنیا سے تعلق رکھنے والے حضرات ان کو دیکھ کر حیرت زدہ ہیں کہ ایک شخص نے تباہ کن وادیوں سے گذرنے کے باوجود اتنا قیمتی سرمایہ علمی دنیا کو دیا، یہ اللہ کی خاص عنایت کا نتیجہ ہی ہوسکتا ہے۔ آپ کی ایک کتاب شرح دیوان متنبّی کو لے لیجئے عربی زبان میں دیوان متنبّی کو وہ حیثیت حاصل ہے جو اردو میں غالب کے اشعار کو، لیکن آپ نے اس کی شرح لکھ کر اس کو اتنا آسان کر دیا کہ علمی دنیا سے وابستہ ہر طبقۂ فکر کے لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں، ہندوستان کے مشہور مقرر اور خطیب مولانا عبدالعلیم فاروقی لکھنوی ایک اجلاس میں شرکت کے لئے ادری تشریف لائے، آپ کا قیام مولوی مرغوب حسن فیض نگر ادری کے دولت خانہ پر تھا، آپ سے ملاقات کی غرض سے مولانا اسیر ادروی خود آپ کی قیام گاہ پر پہنچے، مولانا فاروقی نے آگے بڑھ کر مولانا ادروی سے معانقہ کرتے ہوئے فرمایا: قسم بخدا آپ نے شرح دیوان متنبّی لکھ کر ہم لوگوں پر بہت بڑا احسان فرمایا ہے،

بحمداللہ آپ کی سبھی کتابیں اہل علم کے نزدیک بڑی عقیدت واحترام سے دیکھی اور پڑھی جارہی ہیں، آپ کی کتاب مآثر شیخ الاسلام کی رسم اجراء کے موقع پر مفتی اعظم ہند حضرت مولانا مفتی محمود حسنؒ صاحب نے فرمایا تھا کہ اگر اس کتاب کے مصنف سے ملاقات ہوتی تو اسکے ہاتھ چوم لیتا۔

قصبہ ادری میں عرب جماعت وقتاً فوقتاً آتی رہتی ہے، ابھی حال ہی میں اردن کی ایک جماعت آئی تھی جس میں ایک جیداور باصلاحیت عالم مولانا محمد عامر صاحب بھی تھے، مولانا موصوف بڑے ہی عقیدت واحترام کے ساتھ مولانا اسیر ادروی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے، تقریباً ایک گھنٹہ تک بڑی مؤثر اور علمی گفتگو رہی، مولانا ادروی نے احادیث شریفہ کی عظمت واہمیت پر نہایت گراں قدر گفتگو فرمائی، مہمان مکرم پر اس گفتگو کا اثر یہ ہوا کہ مولانا اسیر ادروی کی کتاب معجم رجال البخاری پر مزید علمی کام کرنے کی اجازت طلب کرتے ہوئے نہایت والہانہ انداز میں یہ فرمایا کہ ان شاءاللہ اس کتاب کی طباعت میں کراؤں گا۔

مولانا موصوف کی کتاب فن اسماء الرجال سے آپ کی وسعت مطالعہ کا پتہ چلتا ہے، اس سے حدیث رسولؐ سے وابستگی اور صحابہ کرامؓ کی مقدس ہستیوں کے دامن تقدس سے وابستہ رہنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، کیونکہ صحابہ کرامؓ نے احادیث کی حفاظت کے لئے جو مشقتیں اور تکلیفیں برداشت کی ہیں، حدیث رسولؐ کو ہر طرح کے شکوک وشبہات سے پاک وصاف رکھنے کے لئے جو جدوجہد کی ہے، وہ تاریخ کا ایک زریں اور روشن باب ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی حدیث کے بلند معیار کو باقی رکھنے کے لئے ایسے اصول وضوابط کی بنیاد رکھی کہ حدیث کا ہر لفظ اپنی پوری صحت وصداقت کے ساتھ موجود ہے، تاکہ امت مسلمہ بددینی اور بے راہ روی کی شکار نہ ہوسکے۔ ان کے بعد اس کو ائمہ وحفاظ حدیث نے ترقی دے کر نہایت مضبوط و مستحکم اصول وضع کیے، راویان حدیث کی پوری زندگی کے حالات کا احاطہ، راوی کون ہے، نسب کیا ہے، کہاں کا رہنے والا ہے، کب پیدا ہوا، عمر کیا تھی، عمر کے کسی حصہ میں یادداشت میں فرق تو نہیں آیا۔ غرض ہر اس پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش کی جس سے آدمی کے ثقہ اور سچا ہونے کا اعتماد بحال ہوجائے، اور اگر اس کی زندگی کے کسی حصہ میں ایسی چیز ظاہر ہوئی ہے جس سے وہ مشتبہ ہے تو اس کو غیر معیاری قرار دے کر اس کی بیان کردہ حدیث لینے سے احتراز کیا گیا ہے۔

صحابہ کرامؓ کے اندر حدیث رسولؐ بیان کرنے میں حد درجہ کا احتیاط اس ارشاد نبویؐ کے پیش نظر تھا ''مَنْ كَذَبَ عليَّ مُتَعَمِّداً فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَه مِنَ النَّار'' (جس نے جان بوجھ کر کوئی جھوٹ

بات میری طرف منسوب کی اس کو اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالینا چاہیے)۔

آپؐ پر والہانہ مرمٹنے والوں سے ممکن ہی نہیں کہ اتنی سخت وعید کے بعد ایسی کسی بات کو آپ کی طرف منسوب کردیں جو آپ سے نہ سنی ہوں، اس کے باوجود کسی صحابی سے کوئی بات حضورؐ کی نسبت سے پہونچتی تو اکابر صحابہ اس کی تحقیق کرتے، اس کی صحت پر ثبوت طلب کرتے، حضرت عمرؓ کی شدت احتیاط کا ایک واقعہ مذکورہ کتاب میں بخاری شریف کے حوالہ سے موجود ہے۔ حضرت ابوسعیدؓ خدری کی روایت ہے کہ ابوموسیٰؓ اشعری حضرت عمرؓ کے مکان پر گئے طلب اجازت کے لئے دروازے کے باہر سے تین بار سلام کیا لیکن کوئی جواب نہیں ملا تو آپ لوٹ آئے، حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا کہ ابوموسیٰؓ اشعری آئے تھے اور لوٹ گئے، آپ نے ایک شخص کے ذریعہ بلوایا، آنے کے بعد آپ نے پوچھا کہ تم کیوں لوٹ گئے؟ تو ابو موسیٰؓ اشعری نے کہا "سمعت ﷺ یقول إذا سلّم أحدُكم ثلاثاً فلم يُجَبْ فليَرْجِعْ" (میں نے حضورؐ سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جب کسی کے پاس جاؤ اور تین مرتبہ سلام کرنے کے بعد جواب نہ ملے تو واپس ہو جاؤ)۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے سخت لب ولہجہ میں فرمایا کہ اگر حضورؐ کی حدیث ہے تو اس پر کوئی شہادت لاؤ ورنہ نتیجہ بھگتنے کے لئے تیار رہو، روایت کے الفاظ ہیں "قال لَتَأتِيَنِّي على ذلك بِبَيِّنَةٍ أو لأفعلَنَّ بك" (کوئی دلیل لاؤ ورنہ جو کچھ کروں گا دیکھوگے)۔ ابوسعیدؓ خدری کہتے ہیں کہ ابو موسیٰؓ ہمارے پاس اس حال میں آئے کہ ان کا چہرہ فق تھا، رنگ اڑا ہوا تھا، ہم کئی افراد بیٹھے ہوئے مصروف گفتگو تھے، ہم نے ان سے پوچھا: ابوموسیٰؓ خیریت تو ہے؟ کیا پریشانی ہے؟ انھوں نے کہا کہ آپ لوگوں میں کسی نے رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث سنی ہے؟ اتفاق سے جتنے لوگ بیٹھے ہوئے تھے سب نے کہا ہم نے حضورؐ سے یہ حدیث سنی ہے، اور جب حضرت ابوسعیدؓ خدری نے حضرت عمرؓ کے پاس جا کر شہادت دی تب حضرت عمرؓ مطمئن ہوئے اور فرمایا "لم أتَّهِمْكَ لكِنْ أحْبَبْتُنَّ أثبت" (میں نے تم پر غلط بیانی کا الزام نہیں لگایا میں نے چاہا کہ بات بالکل پختہ ہو جائے)۔

جلیل القدر صحابیؓ کا یہ عمل حدیث رسولؐ کی بقا اور تحفظ کے ذریعہ امت مسلمہ کے پائے ثبات میں استقامت پیدا کرنے کی ایک ناقابل فراموش کوشش تھی۔ خیر القرون سے جوں جوں دوری بڑھتی گئی لوگوں کے ذہن ومزاج میں بگاڑ پیدا ہوتا گیا اور اس کے برے اثرات بھی رونما ہونے لگے اور سوئے حفظ کا ظہور بھی ہونے لگا، اور اسلام عرب وعجم میں پھیل گیا، جس کی وجہ سے ہر قوم ملک اور ہر

مذہب کے ماننے والے مذہب اسلام کی پاکیزہ تعلیمات سے خود کو آراستہ وپیراستہ کرنے لگے، اس لئے راویوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا اور سندیں طویل ہوتی چلی گئیں، کبھی یہ روایت ایک واسطہ سے محمد عربیؐ سے ہوتی تھی، کبھی دو واسطے سے حضورؐ تک پہنچتی تھی، لیکن دوسری صدی ختم ہوئی تو یہ سندیں طویل سے طویل تر ہو جاتی ہیں، اس لئے وضاع حدیث اپنے مذموم مشغلہ اور گمراہ کن خیالات اور بد عقیدگی کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لئے اپنی ہوس کے مطابق فرضی اور جعلی حدیثوں کو پھیلانے لگے۔ ابن حبان نے اپنی کتاب الضعفاء میں عبدالرحمٰن بن مہدی کا یہ بیان نقل کیا ہے انھوں نے کہا کہ میں نے میسرہ بن عبدربہ سے پوچھا تم یہ حدیثیں کہاں سے لاتے ہو؟ اس نے کہا میں نے لوگوں کو آخرت کی ترغیب کے لئے حدیثیں خود بنائی ہیں، اس کے مرنے کا وقت قریب آیا تو اس سے لوگوں نے پوچھا کہ کیا تم اپنی مغفرت کی امید رکھتے ہو؟ اس نے کہا: کیوں نہیں جب کہ میں نے حضرت علیؓ بن طالب کی فضیلت میں ستر حدیثیں وضع کی ہیں۔ وضع حدیث کا یہ فتنہ مسلمانوں کے ایسے گمراہ کن طبقات کی طرف سے تھا، جو حصول دنیا کی غرض سے اس مذموم حرکت کو کرنے کے لئے آمادہ تھا، اس خطرناک فتنہ سے رسولؐ حدیث کو محفوظ رکھنے کے لئے ایسے طریقہ کار کو اختیار کرنا پڑا جس کے ذریعہ راویان حدیث کی پوری زندگی کے تفصیلی حالات کا علم ہو جائے کیوں کہ اس کے بغیر راوی کا ثقہ اور سچا ہونے کا فیصلہ ممکن نہیں۔ اسی کے پیش نظر علماء محدثین نے شب وروز تلاش وجستجو میں جہد مسلسل کی راوی، اور روایت پر نہایت جرأت اور بے باکی کے ساتھ اصل حقیقت سے روشناس کرانے میں کسی قسم کی کوتاہی کو اپنے دل ودماغ میں جگہ نہ دیکر امت مسلمہ پر ایک بہت بڑا احسان فرمایا ہے، بکر بن خلاد کا بیان ہے کہ میں نے یحیی بن سعید القطان سے کہا کہ آپ کو خوف خدا نہیں کہ لوگوں نے آپ سے حدیث رسول بیان کی اور آپ نے ان کو ماننے سے انکار کر دیا، وہ لوگ جب خدا کے دربار میں شکایت کریں گے الہ العلمین! ہم نے یحیی بن سعید القطان سے رسولؐ کی حدیث بیان کی تو انھوں نے اسکی کوئی پرواہ نہیں کی اور ان کی طرف سے بے پرواہی برتی تو آپ کا کیا جواب ہوگا؟ یحیی القطان نے فرمایا ان حدیث بیان کرنے والوں کا حریف اور مدعی اور فریق مخالف بننا مجھے سو جان سے منظور ہے، لیکن یہ کسی قیمت پر مجھے منظور نہیں کہ حضورؐ مجھ پر دعوی فرمادیں کہ یحیی! میرے اوپر لوگ جھوٹ اور بہتان باندھتے تھے، میرے نام سے جھوٹی حدیثیں بیان کرتے تھے، تم نے اس کا دفاع کیوں نہیں کیا؟ تم نے اس فتنہ کا سر کیوں نہیں

کچل دیا؟ تو بتاؤ میں اس کا کیا جواب دوں گا؟۔

فن اسماء الرجال خالص مسلمانوں کا ایجاد کردہ فن ہے، اس کی روشنی میں ہر واقعہ کی صداقت کو بہتر طور پر جانچا جا سکتا ہے، مؤلف ''تاریخ طبری کا تحقیقی جائزہ'' میں فرماتے ہیں کہ تاریخی روایات میں جو جھوٹے اور خود تراشیدہ افسانوں کی آمیزش کی گئی ہے، راویوں کے بارے میں تفصیلی علم ہی اس خارزار وادی سے دین وایمان کو سلامتی سے نکالے جانے کی راہیں ہموار کر سکتا ہے، اور اس کسوٹی پر پرکھیں تو روایت کے جھوٹ اور سچ کا پتہ چل سکتا ہے، اور حقیقت حال روشن ہو کر آپ کے سامنے آجائے گی، اگر حدیث کے مجموعوں میں کوئی روایت ایسی آتی ہے جس میں روایت کرنے والے کسی راوی کے نام سے اسماء الرجال اور فن جرح وتعدیل کے ماہرین واقف نہیں ہیں، اس راوی کے حالات زندگی روشنی میں نہیں ہیں اور اس کی شخصیت کا واضح تعارف نہیں پایا جاتا ہے، تو پوری روایت اس راوی کی وجہ سے قابل اعتماد نہیں رہ جاتی اور کسی مسئلہ میں اس روایت کو بطور دلیل پیش نہیں کیا جا سکتا، ایسے راوی کو محدثین کی اصطلاح میں مجہول راوی کہا جاتا ہے، اور مجہول راوی کی کوئی روایت قابل قبول نہیں ہوتی۔ احادیث کے پورے ذخیرے میں جتنے راویوں کے نام آئے ہیں، ان کی پوری اور مکمل فہرست ان کے حالات زندگی ان کے دین ودیانت، وثوق واعتماد، ان کے شیوخ حدیث کا ذکر، ان کے بارے میں علماء جرح وتعدیل کی رائیں، وہ سب مسلمانوں کے پاس محفوظ ہیں، راویوں کے حالات پر مشتمل کتابوں کو ''فن اسماء الرجال'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، معتمد اور معتبر حدیث کے مجموعوں میں جو مسلمانوں کے نزدیک قابل حجت ہیں، ایسی تمام حدیثوں اور روایتوں میں آنے والے سارے ناموں کا ہمیں تفصیلی علم حاصل ہے، اور کوئی گمنام راوی مستند احادیث میں دخل ہی نہیں پا سکتا (افکار عالم)

قرآن پاک کے معانی ومضامین کی اصل شرح رسول پاک ﷺ کے افعال واقوال ہیں جن کے مجموعے کا نام حدیث ہے، یہ تاریخی معجزانہ حقیقت ہے کہ کسی پیغمبر کے افعال واقوال کو ان کے متبعین نے اس طرح منضبط نہیں کیا کہ وہ علم وتحقیق کی کسوٹی پر پرکھے جا سکیں اور کسی بھی تصرف سے پاک رہیں، یہ سرکار دو عالم ﷺ کی امت ہی کی خصوصیت ہے کہ اس کے مخلص و دیانتدار علماء و محققین نے اپنے پیغمبرؑ کے تمام اقوال وافعال اور تقریرات کو تفتیش وتحقیق کے مضبوط اصول پر پرکھ کر ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا اور حدیث کے روایت کرنے والوں کے حالات اور انکی دیانت وثقاہت، علم وتقوی، بقیہ صفحے پر

اہل علم کے خطوط بنام حضرت محدث کبیرؒ

(مکاتیب حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ)

ترتیب: مسعود احمد الاعظمی

حضرت مخدومی! دامت فیوضکم۔

سلام مسنون

پرسوں مولوی سعید الرحمٰن نے مجھ سے شہد کے بارے میں دریافت کیا تھا، تو میں نے عرض کر دیا تھا کہ مولوی عبدالصمد صاحب آئے تو تھے لیکن شہد نہیں دے گئے۔

پھر آج ہی کانپور سے مولوی اسرارالحق صاحب کا بھیجا ہوا یہ شہد آیا اور ساتھ میں یہی پرچہ، مجھے اس شہد کی بس اتنی ہی سند معلوم ہے۔

خدا کرے مزاج گرامی بخیر و عافیت ہو۔ اعظم گڈھ آنے کے قبل رمضان میں میرا جو ایک وعدہ تھا پھر وہ ملتوی ہو گیا تھا، اب ممکن ہے کہ عید کے دو چار دن بعد آنا ہو، اگر ایسا ہوا تو انشاء اللہ مئو ضرور حاضری ہوگی۔

مبارک پور کے واقعہ کے بارہ میں آج قومی آواز میں مولانا حفظ الرحمٰن کا جو بیان شائع ہوا ہے، اسے پڑھ کر طبیعت بہت متاثر ہوئی ہے، فاللہ المستعان۔ دعاؤں میں شریک فرمانے کا سائل اور امیدوار ہوں۔ والسلام

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

۲۷؍رمضان مبارک

....

مخدومی مطاعی! متعنا اللہ بدوام بقائہم

سلام مسنون، مئو سے واپس ہو کر جب میں بریلی پہنچا تو یہاں گاڑیوں بلکہ ریلوں کا کام جمع تھا، سب سے پہلے اس کو ختم کرنا چاہا، شوال کی پرچہ کی ترتیب بھی مکمل نہیں ہوئی تھی، اس کو کسی طرح پورا

کیا، ابھی فراغت نہیں ہوئی کہ یکلخت حضرت والد ماجد اور والدہ ماجدہ نے حج کا ارادہ کرلیا اور مجھے اطلاع دی، میں فوراً چلا گیا۔ کئی دن وہاں رہنا پڑا، ان دنوں میں پھر کام جمع ہوگیا اور ذیقعدہ کے پرچہ کی تیاری کا وقت بھی آ گیا اور میں اب تک اس بار کو ہلکا نہیں کرسکا اور اتنا اطمینان نصیب نہیں ہوا کہ اس معاملہ کے متعلق مفصل عریضہ لکھ سکتا۔ آج فرصت سے مایوس ہوکر یہ عریضہ لکھ رہا ہوں، آج ہی مولوی محمد ایوب صاحب کو بھی لکھوں گا، لیکن اس کو کل حوالۂ ڈاک کروں گا۔

اس وقت یہ تو یاد بھی نہیں کہ کیا کیا باتیں لکھنے کا ارادہ تھا، تاہم جو کچھ ذہن میں ہے منتشر طور پر عرض کرتا ہوں۔

....

پہلے میرا خیال تھا کہ اس سال رمضان سے پہلے پہلے اس کی ایک جلد چھاپ کر تیار کر لی جائے، لیکن اب زیادہ غور خوض کے بعد یہ مشکل نظر آتا ہے تاہم جب بھی ہو سکے۔

....

اس وقت دس جلدوں کا اندازہ ہے۔ ہر جلد کے صفحات تخمیناً پانچ سو ہوں گے۔ سائز ۱۷-۲۷ یعنی فل سکیپ رہے گا۔

....

ہر جلد اگر چھ ماہ میں نہیں تو کوشش کر کے زیادہ سے زیادہ آٹھ ماہ میں تیار کرنے کی کوشش کی جائے گی، تاکہ کام کا سلسلہ ایک نظام کے ساتھ جاری رہ سکے۔

....

یہ تو میں عرض کر ہی چکا تھا کہ بحالت موجودہ کسی اطمینانی فرصت سے مایوس ہوں، تاہم صرف ترجمہ کا کام اپنے ذمہ لے سکتا ہوں، اسی کے ساتھ اگر کوئی خاص بات ذہن میں آئے گی تو بطور مشورہ لکھ دیا کروں گا اور وہ ترجمہ یہاں سے بھیج دیا کروں گا۔ شرح کا کام کل جناب ہی کی ذمہ داری پر ہوگا، اگر خدا نے کبھی کچھ زیادہ فرصت دے دی تو ممکن ہے کہ آئندہ کسی وقت کچھ زیادہ حصہ لے سکوں، مگر احتیاطی پروگرام یہی ہے کہ سوائے ترجمہ کے میں گویا کچھ بھی نہیں کروں گا، ہاں۔ کتاب کی لوح پر میں بھی شریک رہوں گا۔

اس کے بعد ایک چیز رہ جاتی ہے، جس کے متعلق باوجود کوشش کے اس وقت میری زبان نہ اظہاراً کھل سکی نہ استفساراً اور اب بھی قلم اٹھنے کے لیے تیار نہیں، مگر چونکہ ضروری اور نہایت ضروری ہے اس لیے اس

وقت میں دل اور قلم دونوں پر جبر کروں گا اور اس کو ضرور لکھوں گا اور وہ یہ ہے کہ معاملہ کی نوعیت کیا رہے گی؟

اگر جناب والا نے اس کے متعلق کچھ غور فرمایا ہو تو بالکل بے تکلفی سے تحریر فرمائیں، اگرچہ میری طرح دل پر جبر کرنا پڑے اور اس معاملہ میں یقیناً ایک وقت کرنا پڑے گا۔

اور اگر کچھ غور نہ فرمایا ہو تو جو میں نے سوچا ہے اس پر غور فرما کر اظہار رائے فرمایا جائے اور وہ یہ ہے کہ بہرحال (خواہ میں کچھ کام کرسکوں یا نہ کرسکوں) آپ اس کے لیے جو وقت مدرسہ سے لیں گے یا اپنے دوسرے کاموں کا جو نقصان کریں گے صرف اس کی ناکافی تلافی دو ہزار روپے سے کی جائے گی، یعنی فی جلد دو سو روپئے، جو یقیناً کچھ بھی نہیں ہے۔

....

مولانا محمد ایوب صاحب کو جو خط لکھا ہے اس کا مضمون صرف یہ ہے:

سلام مسنون، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کے متعلق جو گفتگو اس وقت میں نے آپ سے کی تھی کہ آیا آپ اس خاص کام کے لیے مولانا کو مدرسہ سے کچھ رخصت دے سکیں گے یا نہیں اور اس کی کیا نوعیت ہوگی؟ آپ حضرات نے اس طویل عرصہ میں اس پر کافی غور فرمالیا ہوگا، جو رائے قائم ہوئی ہو اس سے مطلع فرمایئے، کیونکہ اب میں اس کام کی بنیاد جلد ہی ڈال دینا چاہتا ہوں، صرف آپ کے جواب کا انتظار ہے۔ والسلام

ایک خط مولانا عبد اللطیف صاحب کو بھی لکھا ہے کہ اس کا جواب ذرا جلد دلوا دیجئے۔ والسلام

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

۱۱/۱۱/۵۲ھ

....

غازی پور میں مدرسہ دینیہ کا جلسہ ہو رہا ہے وہ باصرار بلا رہے ہیں، میں نے اپنی ضرورت سے جناب کے متعلق بھی لکھ دیا ہے، اگر دعوت آئے تو تشریف لے آیئے۔ والسلام۔

....

باسمہ سبحانہ وتعالی

از ناچیز محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

لکھنؤ - ۱۳/ شعبان ۷۷ھ

حضرت معظمی محترمی! دامت فیوضکم۔

سلام مسنون۔ میں یکم مارچ کو بہار شریف کے اجتماع کے لیے چلا گیا تھا، کل واپسی پر گرامی

نامہ مؤرخہ ۹ر شعبان دیکھا، طبیعت کی ناسازی کا علم ہوا، اللہ تعالیٰ صحت وقوت عطا فرمائے۔

میں نے جلسہ کے موقع پر مئو حاضری کا مصمم ارادہ کرلیا تھا، اور پروگرام یہ بنایا تھا کہ بہار شریف سے سیدھا مئو آجاؤں گا اور تیسری کی شام تک پہنچ جاؤں گا، لیکن پھر معلوم ہوا کہ تاریخیں ۹/۸/ ۱۰/ مارچ ہوگئیں، یاد ہوگا جناب کی موجودگی ہی میں مولانا محمد صدیق صاحب تشریف لائے تھے، اسی وقت ان سے یہ طے ہوگیا تھا کہ میں ۹/ مارچ کو یہاں سے روانہ ہوکر رات کانپور گزار کر ۱۰/ مارچ کی صبح کو ان کے یہاں جاؤں گا۔ اس لیے اب مئو کی حاضری کی کوئی صورت نہیں رہی، خود مجھے افسوس ہے اور کئی روز ہوئے اس کے بارہ میں میں نے مولانا محمد ایوب صاحب کی خدمت میں عریضہ لکھ دیا تھا۔

گرامی نامہ پڑھ کر کل شام میں خود پریس گیا، وہاں معلوم ہوا کہ کتابت بالکل ختم ہوچکی ہے، لیکن پہلے آٹھ صفحہ کا ابھی مضمون بھی آپ کی طرف سے نہیں آیا ہے، صرف آخری آٹھ کا پیاں جمنے سے باقی ہیں، جن میں سے پانچ کئی روز سے مولانا عبدالحفیظ صاحب کے پاس ہیں، تین ترمیم بننے کے لیے کاتب کے یہاں گئی ہوئی ہیں جو کل آجائے گی اور جم جائے گی، لیکن کتاب کا جو کاغذ خریدا گیا تھا، وہ ختم ہوگیا ہے اور کاغذ نہ ہونے کی وجہ سے طباعت کا کام رک گیا ہے، کاغذ کے روپے کا انتظار ہے۔

یہاں میں بے تکلف یہ عرض کردوں کہ...... کے معاملات کی خرابی کی وجہ سے کاغذ قرض نہیں مل سکتا، اپنی ضرورتوں کے لیے ہم لوگ بھی نقد ہی خریدتے ہیں۔

میں نے صرف...... کے کہنے پر اعتبار نہیں کیا، بلکہ چھپے ہوئے فرمے اور پلیٹیں خود بھی دیکھ کر اطمینان کیا کہ کام اتنا ہوچکا ہے اور اب کاغذ ہی کے انتظار میں رکا ہوا ہے۔

شاید یہ تو جناب والا کے علم میں ہے کہ جن دو کاتبوں نے کتاب لکھی ہے، ان دونوں کے پاس میرا کام تھا جو ان سے واپس لے کر اعیان الحجاج کی کتابت کرائی گئی ہے۔ کتابت کی مشکلات کا اندازہ مشکل ہے۔

....

محترمی ومعظمی! زید مجدکم۔

سلام مسنون۔ پرسوں اجتماع کی سخت مشغولیت کے وقت کسی صاحب نے گرامی نامہ دیا تھا، ضعف دماغ اور کج خلقی کی وجہ سے جھنجھلاہٹ میں میں نے ان سے کہہ دیا کہ میں اجتماع کے بعد پڑھ سکوں

گا، ان دنوں میں جو ڈاک آئی میں اس کو بغیر پڑھے ہی رکھتا رہا ہوں، بعد میں خیال ہوا کہ میں نے بڑی غلطی کی، معذرت کے لیے ان صاحب کو تلاش کیا، لیکن وہ نہیں ملے، ان کے ساتھی اتفاق سے آج مل گئے اور انھوں نے بتایا کہ وہ صاحب واپس جا چکے ہیں، میں نے ان کے ذمہ کیا ہے کہ وہ ان سے مل کر میری طرف سے معافی مانگ لیں، میں اس معاملہ میں بہت مقصر ہوں، اللہ تعالیٰ میری اصلاح فرمائے۔

میرے پاس جو کاپیاں موجود تھیں مولوی سعید الرحمٰن صاحب کے سپرد کر دی تھی، یہ شروع سے لے کر ۱۴۴ صفحے تک ہیں، شروع کے ۸/ صفحے ابھی نہیں لکھے گئے ہیں، مقدمہ پہنچ گیا ہے، وہ ان ۸/ صفحات مع لوح اور فہرست کے ان شاء اللہ آ جائے گا، درمیان کا ایک جز ۸۱ تا ۹۶ ان میں نہیں ہے، غالبًا کاتب صاحب کے پاس رہ گیا ہے، میرا اندازہ ہے کہ ۴۰، ۵۰ صفحے کتابت شدہ اور تیار ہوں گے جو میرے پاس ابھی تک نہیں آئے، ان کی تصحیح کر کے جلد سے جلد واپس فرما دیا جائے، حتی الوسع کوشش کی جائے گی کہ رمضان میں تیار ہو جائے۔

ڈاک سے جو مسودہ آیا ہے، یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس کے بعد بھی کچھ باقی ہے یا نہیں، اگر باقی ہے تو فوراً بھیجا جائے، اور اگر باقی نہیں ہے تو ختم کی کوئی سطر بڑھا دی جائے، کم از کم اتنی بات کہ حصہ اول ختم ہو گیا، حصہ دوم عنقریب شائع ہوگا، جو فلاں مضمون پر مشتمل ہوگا۔

میں یہ عریضہ انتہائی عجلت میں اور مولوی سعید الرحمٰن صاحب سے لکھوا رہا ہوں، والسلام۔

مولانا محمد منظور نعمانی

بقلم سعید الرحمٰن

۲۵/ شعبان المعظم ۹۷ھ

....

از منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

نزیل دار العلوم دیوبند ۳/۱۱/۸۱

حضرت مخدومی معظمی! دامت فیوضکم۔

سلام مسنون

اخیر مارچ میں میں کلکتہ گیا ہوا تھا، قریباً ایک ہفتہ کے بعد ۵/ اپریل کو لکھنؤ واپسی ہوئی تھی اور ڈیڑھ دو دن وہاں رہ کے پرسوں ۷ کو یہاں کے لیے روانہ ہو جانا پڑا، مجلس تو ملتوی ہو چکی تھی، لیکن

جائزہ کے کام کی تکمیل ہم لوگوں نے ان دنوں میں طے کر لی تھی۔

حضرت مولانا عبدالشکور صاحب مدظلہ بظاہر اس وقت دنیا اور آخرت کے درمیان ہیں، یہاں کے لیے روانگی سے پہلے ۷؍ کو بھی میں حاضر خدمت ہوا تھا، ہوش کسی وقت ہوتا ہے اور کسی وقت نہیں، اگر ابھی جناب تشریف نہ لے گئے ہوں تو فوراً لکھنؤ تشریف لے جائیں، بلکہ جس حال میں پرسوں میں نے دیکھا تھا اس کے پیش نظر تو شک ہے کہ حضرت موصوف کس دار میں ہوں گے۔ اگر یہاں آنا ناگزیر نہ ہوتا تو نہ آتا۔

یہ صحیح ہے کہ اخبار کے لیے بہتر ذریعہ ایجنٹ ہی ہو سکتے ہیں، طلبہ کا وہ وفد تو صرف ابتدائی تعارف کے لیے بعض مقامات کو بھیج دیا گیا تھا اور ان لوگوں کا جانا مفید رہا۔

ترمذی شریف کے بارہ میں انشاء اللہ اب عندالملاقات ہی کچھ عرض کروں گا۔ دعا کا محتاج وطالب ہوں۔

مولانا عبدالجبار صاحب اور مولوی رشید احمد صاحب کو بشرط یاد وسہولت سلام مسنون۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

....

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

لکھنؤ - ۱۰ محرم ۸۲ھ

حضرت مخدومی! دامت فیوضکم۔

سلام مسنون

بستی کے اجتماع میں مئو کے بعض احباب سے معلوم ہوا تھا کہ مزاج گرامی کچھ ناساز تھا اب بہتر ہے، لیکن ضعف کافی ہو گیا ہے۔ بستی سے واپسی میں حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کو لکھنؤ میں قیام فرمانا تھا، اگر یہ طے شدہ نہ ہوتا تو میں بستی سے مئو حاضر ہوتا، لیکن اس وقت مجبوری تھی، ارادہ کر لیا تھا کہ لکھنؤ سے عریضہ لکھوں گا، لیکن آج تک نوبت نہیں آئی، آج ہی مولوی عتیق الرحمٰن سلمہ نے بتایا کہ الجمعیۃ میں طبیعت کی ناسازی کی اطلاع جس طرح حال میں آئی تھی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خدا نا خواستہ طبیعت کچھ زیادہ خراب چل رہی ہے اور ابھی تک علالت کا سلسلہ جاری ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے خاص کرم سے شفاء کامل عاجل عطا فرمائے۔ مولانا عبدالجبار صاحب یا کوئی

اور بھائی براہ کرم بواپسی کیفیت مزاج گرامی سے مطلع فرمائیں۔

''ندائے ملت'' نے اتنا مصروف کردیا ہے کہ حواس خراب رہتے ہیں، ضروری ضروری کام یاد نہیں رہتے، والسلام۔

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

....

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

از لکھنؤ - ۲/۴/۷۷ء

حضرت مخدومی! دامت فیوضکم۔

سلام مسنون

والا نامہ نے مشرف فرمایا۔ خطوط نویسی کے باب میں ہمیشہ سے کوتاہ کار ہوں، والدین ماجدینؒ کی حیات میں بھی کئی کئی مہینے میں خط لکھتا تھا۔ اللہ تعالیٰ اس تقصیر کو معاف فرمادے۔

مولوی عتیق الرحمٰن سلمہ سے معلوم ہوا کہ رسالہ ''رکعات تراویح'' آچکا ہے، میں نے صرف کتابت طباعت دیکھنے کے لیے ورق گردانی کی۔ کتابت تو اچھی ہے، چھپائی اچھی نہیں ہوئی ہے۔

میں نے پہلے بھی غالباً عرض کیا تھا کہ یہاں اچھے کاتب ہمارے نزدیک صرف دو ہیں اور ان سے کام کرانے میں بڑی دیر لگ جاتی ہے، اس لیے اگر ایسا ہو سکے کہ اعظم گڈھ کے ہی کاتب لکھ دیں جنھوں نے رسالہ تراویح لکھا ہے تو چھپائی یہاں ہفتہ عشرہ میں انشاء اللہ اچھی ہو سکتی ہے، اور اگر یہ نہ ہو سکے تو پھر تاخیر برداشت کرنی پڑے گی، جس سے میں سخت عاجز آجاتا ہوں۔

اس سے میں بالکل متفق ہوں کہ چھپائی کتاب کی تا امکان بہتر سے بہتر ہونی چاہئے۔ کتاب کو چار چاند لگ جاتے ہیں مقبولیت ونافعیت تک پر اثر پڑتا ہے۔

رسالہ ''رکعات تراویح'' پر تبصرہ انشاء اللہ ہوگا اور کتب خانہ کی طرف سے اشتہار بھی دے دیا جائے گا۔

خدا کرے مزاج گرامی ہر طرح بعافیت ہو، والسلام۔

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

حضرت مخدومی ومکرمی! دامت فیوضکم۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔قریباً سوا ہفتہ سفر میں رہنے کے بعد پرسوں واپس آیا ہوں، جمع شدہ ڈاک میں ایک گرامی نامہ بھی ملا، آ کرا تنا معلوم ہوا کہ کتاب برابر لکھی جارہی ہے اور چھپ رہی ہے، جس کاتب سے معاملہ کیا گیا تھا وہ تو بالکل نہیں لکھ سکے دوسرے کاتب جن کو میں اپنی ایک کتاب لکھنے کے لیے دے گیا تھا، وہی ''اعیان الحجاج'' لکھ رہے ہیں۔ میری کتاب بالکل رک گئی، معلوم ہوا کتاب بہت اچھی چھپ رہی ہے۔

''رکعات تراویح'' میں ابھی تک دیکھ بھی نہیں سکا ہوں، عتیق سے کہوں گا کہ وہ اس پر جلد ہی تبصرہ کریں۔ آپ نے اس کی قیمت یا تو زبانی بتلائی تھی یا تو اس سے پہلے کسی گرامی نامہ میں لکھی تھی، لیکن اب مجھے یاد نہیں رہی، اب پھر مطلع فرمایئے تا کہ تبصرہ میں اس کا اظہار ہو جائے۔

میری طبیعت سفر میں خراب ہوگئی تھی، اب تک اس کے اثرات ہیں، معلوم ہوا کہ اس عرصہ میں تشریف آوری ہوئی نہیں، خدا کرے مزاج بعافیت ہو۔ والسلام۔

محمد منظور نعمانی

....

باسمہ سبحانہ وتعالی

لکھنؤ-۱۹/مئی ۵۹ء

حضرت مخدومی محترمی! دامت فیوضکم۔

سلام مسنون

گرامی نامہ نے مشرف فرمایا۔اب الجمعیۃ میرے ہاں صرف ہفتہ وار اڈیشن آتا ہے اور اس کو بھی میں اہتمام اور پابندی سے نہیں دیکھ پاتا، اس لیے میں بالکل بے خبر تھا، اور افسوس ہے کہ مئو حاضری کے موقع پر بھی میرے سامنے کوئی ذکر نہیں آیا[1]۔

خود میرا حال یہ ہے کہ بہ نسبت لڑکوں کے مجھے بچیوں سے زیادہ تعلق ہے، رسول اللہ ﷺ کے لیے اللہ تعالی نے صاحبزادیوں ہی کو منتخب فرمایا تھا، پھر آپ کو کیسا تعلق تھا، پھر ان کی مفارقت کا صدمہ بھی حصہ میں آیا، اس طرح تو یہ بھی ایک نبوی میراث ہے، بقیہ صفحہ ۴۶ پر

(۱) یہ خط محدث الاعظمیؒ کی صاحبزادی صفیہ خاتون کی وفات-۲۱/شوال ۱۳۷۶ھ= ۱۹۵۹ء- کے موقع پر تحریر فرمایا گیا ہے (مدیر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیز مکرم فاضل گرامی مولانا ڈاکٹر مسعود احمد صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

یہ میرے لیے سوہان روح حادثہ ہے، بلکہ اہل علم کے لیے بھی کہ اکابر علماء کرام کے مکتوبات کی فائل نہ جانے کہاں اور کس کے ہاتھ لگ گئی، ہزار جستجو کے باوجود اس کا سراغ نہ ملا۔ اس میں حضرت مولانا سید فخر الحسن صاحبؒ سابق صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ، حضرت مولانا محمد عثمان فارقلیطؒ، حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحبؒ، اور محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمہم اللہ کے مکتوبات گرامی تھے۔ ان اکابر علماء نے اپنے مکتوبات میں میرے طالب علمانہ سوالات کے علمی جوابات دیے تھے، بلاشبہہ یہ اہل علم کے لیے قیمتی سرمایہ تھے، یہ متاع گم شدہ کہاں سے لاؤں۔ حضرت محدث الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ سے جو سوالات کیے تھے، ان کے دھندھلے نقوش اور جوابات کی چند باتیں اپنے الفاظ میں محفوظ ہیں، ان کو پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں، آپ مناسب سمجھیں تو حضرت محدث الاعظمیؒ کے مکتوبات کے بجائے اس یادداشت کو قبول فرمالیں۔

۱:- ۷۸۶ جو عموماً مکتوب نگار سرناموں پر لکھتے ہیں اور اس گنتی کو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا بدل سمجھتے ہیں، کتاب وسنت کی روشنی میں ''صدق جدید'' لکھنؤ میں راقم الحروف نے اپنی تحریر ۷۸۶ کے رد میں شائع کرائی۔ مولانا دریابادی نے اس پر کوئی نوٹ نہیں لکھا، البتہ مولانا عون احمد قادریؒ نے رخصت وعزیمت کی بحث چھیڑ کر ۷۸۶ کو رخصت کے خانہ میں ڈال دیا، ''صدق جدید'' میں مولانا قادری صاحب کی تحریر شائع ہونے کے بعد مولانا عتیق احمد بستوی نے اس کا بھرپور تعاقب کیا اور اسی پر بحث ختم ہوگئی، مزید تحقیق اور فیصلہ کے لیے ازسرنو میں نے یہ بحث محدث الاعظمیؒ کی خدمت میں پیش کر دی، حضرت نے میری تحریر کی تصویب کرتے ہوئے تحریر فرمایا کہ:

''۷۸۶ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا رمز ہے، بدل نہیں ہے، اس لیے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھنا چاہئے''

۲:- دور جاہلیت میں بچیوں کے ختنہ کا رواج تھا، اس سلسلہ کی حدیث میں نے پڑھی تھی، حوالہ یاد نہیں تھا، میں نے حضرت محدث الاعظمیؒ کی خدمت میں یہ قضیہ پیش کر دیا، حضرت نے ابوداؤد کی حدیث سنادی اور فرمایا کہ فقہی کتابوں میں اس کی بحث موجود ہے، بعض نے مستحب کہا ہے، لیکن

عملاً متروک ہے، درحقیقت یہ جاہلی رواج تھا جو عرب وعجم میں نظر نہیں آتا۔

۳:- راقم الحروف ''بائبل اور نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم'' کی ترتیب وتالیف میں مصروف تھا، ''زمزم'' کے تعلق سے ایک ناگزیر بحث آگئی، بخاری شریف کی ایک طویل حدیث میں واقعۂ زمزم مذکور ہے، اسی کے ساتھ میں نے دیگر کتب حدیث سے بھی رجوع کیا، حافظ ابن کثیرؒ نے بخاری شریف کی روایت پر نقد کرتے ہوئے یہ الفاظ بھی لکھے کہ ''**مطرز بالاسرائیلیات**''. اس تیز تنقید نے طبیعت میں خلجان پیدا کر دیا، چنانچہ اپنا خلجان دور کرنے کے لیے متعدد شیخ الحدیث صاحبان سے رجوع کیا، لیکن اطمینان بخش جواب نہیں ملا اور حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کا نقد کھٹکتا رہا، بالآخر میں نے حضرت محدث جلیل الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت عالیہ میں سوال پیش کر دیا، حضرت نے از راہ شفقت بواپسی ڈاک جواب ارسال فرما دیا، نہایت جامع مختصر اور اطمینان بخش، حضرت کے الفاظ تقریباً یہ تھے، میں نے اپنی کتاب بائبل اور نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم میں اس کا حوالہ بھی دیا ہے، حضرت محدث الاعظمیؒ کا جواب یہ تھا:

> ''حافظ ابن کثیرؒ کا نقد حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے انداز بیان اور ان کے بیان پر ہے اور قصۂ زمزم بیان کرتے ہوئے حضرت ابن عباسؓ نے جہاں کہیں قال رسول اللہ کہہ کر آپ کا ارشاد گرامی نقل کیا ہے، وہ حدیث مرفوع ہے اس پر کسی کو کلام کرنے کی گنجائش نہیں ہے، حافظ ابن کثیرؒ نے اس پر نقد نہیں کیا ہے۔''

کیا دقت نظر تھی! اس کی تحسین کن الفاظ میں کی جائے! ذہن کی رسائی اور احادیث کی ادا شناسی پر خراج کس طرح پیش کیا جائے!

۴:- نماز جمعہ کے خطبہ میں خطیب علماء کرام خطبہ کا آغاز **الحمدللّٰہ الحمدللّٰہ نحمدہ ونستعینہ** الخ سے کرتے ہیں، یعنی **الحمدللّٰہ** مکرر کہتے ہیں ہر خطیب تو نہیں، بیشتر ایسا ہی کرتے ہیں، میں نے یہ تکرار کسی حدیث میں نہیں دیکھی تو کھٹک پیدا ہوئی اور سوال حضرت محدث الاعظمیؒ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ جواب عنایت ہوا۔

> ''تکرار ثابت نہیں ہے، یہ خطباء کی اپنی ایجاد ہے''

اس طرح کے نہ جانے کتنے چھوٹے بڑے طالب علمانہ سوالات حضرت محدث الاعظمیؒ کی خدمت عالیہ میں پیش کیے اور حضرت نے از راہ شفقت جوابات مرحمت فرمائے، لیکن یہ علمی سرمایہ محفوظ نہیں رہ سکا، حافظہ میں جو کچھ محفوظ تھا وہ نذر قارئین ہے۔

عبدالحفیظ رحمانی- لوہرسن ضلع سنت کبیر نگر ۲۷۲۲۷۰

۲۷/ جون ۲۰۱۳ء ۱۷/ شعبان ۱۴۳۴ھ